جلد سوم | بابت جولائی سنہ ۱۹۲۳ء | حصہ یازد

اردو

انجمن ترقی اردو
کا
سہ ماہی رسالہ

فہرست مضامین

وضع اصطلاحات علمیہ

(از ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری مرحوم و مغفور)

چند سال ہوئے جب کہ انجمن ترقی اردو، سررشتۂ تالیف و ترجمہ (حیدر آباد دکن) کے اتحاد سے وضع اصطلاحات علمیہ کا کام انجام دے رہی تھی، میں نے اپنے چند فاضل احباب سے یہ التجا کی کہ وہ اس اہم مسئلہ کے متعلق اپنی اپنی رائے تحریر فرمادیں تو میں اُن سب کو ایک کتاب کی صورت میں طبع کرکے شایع کردوں، تاکہ عام طور پر دوسرے اصحاب کو اس پر غور کرنے اور رائے قایم کرنے کا موقع ملے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے یہ مضمون میری درخواست پر تحریر فرمایا تھا۔ میں کسی طرح یہ بھول نہیں سکتا کہ ڈاکٹر مرحوم کی بے وقت وفات سے ہمارے ملک اور خاص اُردو زبان کو کس قدر شدید نقصان پہونچا ہے۔ انھوں نے زبان کی موجودہ ضروریات پر خوب غور کیا تھا اور ہر مسئلہ پر قطعی اور صاف رائے رکھتے تھے۔ اُمید ہے کہ یہ عالمانہ مضمون غور سے پڑھا جائے گا اور اگر کوئی صاحب اس مسئلہ پر اُردو میں اپنی رائے کا اظہار فرمائیں گے، تو میں بہت ممنون ہوں گا۔ (اڈیٹر)

(۱)

"اے زبان تو طاقت ہیں نمونۂ قدرتِ الٰہی ہے۔ دیکھ اس طاقت کو رائگاں نہ کھو اور اس قدرت کو خاک میں نہ ملا ... ..." (مولانا حالی)

زبان نے انسان کو اشرف المخلوقات کا لقب دیا ہے۔ عقل کے اظہار کا ذریعہ نطق ہے اور نطق انسانی کا مشرف پیرایہ عقل ہے۔ اتحادِ زبان تنِ قومی کی رُوح رواں اور جسم ملی کی جان ہے۔ زبان ہی وہ بنیاد ہے جس پر سیاست کا اساس قایم ہے زبان ہی وہ معیار ہے جس سے یگانوں اور بیگانوں میں امتیاز ہوتا ہے۔ خود مذہب تک زبان کا

تابع ہی بقول شاعر ؎

ذاتِ پاکِ تو دریں ملکِ عرب کردہ ظہور زاں سبب آمدہ قرآں بزبانِ عربی!

غرض جس طرح نطق انسان کا خاصہ ہی ویسے ہی زبان قومیت، حکومت اور مذہب کی رُوح رواں ہی جس طرح ایک جان دوسرا قالب اختیار نہیں کر سکتی اُسی طرح کوئی قوم اپنی زبان نہیں بدل سکتی۔ بہت سی قوموں نے جو بزورِ شمشیر یا بزورِ قلم دوسری قوموں سے مغلوب ہوگئی ہیں اُس تقلید کی بنا پر جو محکوم مِلّتوں کی غلامی کا راز ہی یہ کوشش کی ہی کہ غالب قوم کی زبان کم و بیش اختیار کر لیں لیکن ایسی سعی کا انجام ہمیشہ اُن کی تباہی ہُوا ہی۔ روما نے باوجود اِس کے کہ تیغِ نصرت اُس کے ہاتھ میں تھی جب مفتوح یونان کی زبان کو اختیار کرنے میں جدّ و جہد شروع کی تو روما کی تہذیب میں انحطاط شروع ہوگیا اور علوم و فنون میں بجائے ترقی کے تنزل کے آثار نمایاں ہوگئے یہ روما کی خوش قسمتی تھی کہ اہلِ روما وقت پر اپنی شدید غلطی سے واقف ہوگئے ورنہ ممکن نہ تھا کہ اُن کی ہستی بربادی سے محفوظ رہ سکتی۔ یورپ میں جب تک مادری زبانوں کے مقابلہ میں لاطینی کو فروغ رہا اہلِ یورپ علم اور حقیقی آزادی دونوں سے محروم رہی لیکن روما اور یورپ میں زبان میں کورانہ تقلید کے اثر کو سیاسی آزادی نے ایک حد تک باطل کر دیا تھا۔ مگر ہمارے قبضے میں نہ قلمِ تعلیم ہی نہ سیفِ سلطنت اگر ہم اپنی زبان کی طرف سے ایسے ہی غافل رہیں جیسے کہ عام طور پر ہیں تو اس کا انجام ہماری قطعی اور یقینی قومی موت ہی۔

میں پھر کہوں گا کہ زبان فاتح کی تلوار کی آواز کا نام نہیں ہی۔ فاتح اپنا خطبہ اور سکّہ جاری کر سکتا ہی لیکن اپنی زبان جاری نہیں کر سکتا۔ مفتوح فاتح کا مذہب اختیار کر سکتا ہی لیکن اُس کی زبان اختیار نہیں کر سکتا۔ زبان ملک اور ملّت کے قلب کی حرکت کی صدا ہی۔

آج ہم میں چند لوگ ایسے ہیں جنھوں نے ہندوستان اور یورپ میں تعلیم پاکر انگریزی اور دیگر السنۂ مغربیہ میں کتابیں تصنیف کی ہیں لیکن زمانہ اِن تصنیفات کا سب سے بڑا دشمن ہی۔ ہر تصنیف ہمارے اہلِ ملک کی جو اُردو میں نہ ہو ایک عارضی ہستی رکھتی ہے۔ ہندوستان میں آج انگریزی کا یہ زور شور ہی کہ ہندوستانی شعرا تک انگریزی میں کلام موزوں کرتے ہیں اسی طرح انگلستان میں شکسپیر اور ملٹن کے زمانہ میں لاطینی میں اگر شعر کہا جاتا تھا تو داد ملتی تھی اور مادری زبان میں عمدہ سے عمدہ کلام کا کوئی پُرسان نہ تھا۔ آج کوئی بتا سکتا ہے

کہ وہ لاطینی شاعری کہاں ہے۔ عجائب خانوں کی دائم مقفل الماریوں کے سوا ان اجزا کا کہیں پتہ نہیں اور لاطینی الاصل اہل زبان کی رائے میں وہ کلام طالب علموں کی مشق سے زیادہ مرتبہ نہیں رکھتا لیکن ملٹن کی وہ انگریزی تصنیف جس کا معاوضہ مصنف کو بمشکل تمام بیس روپیہ ملا تھا اور جس کو ہر شخص حقارت سے دیکھتا تھا اب انگریزی علم ادب کی جان ہے۔ انگریزی ملت کی ہستی آج ملٹن اور شکسپیر کے کلام پر قایم ہے۔

ہندوستان میں زبان سے غفلت کا الزام تمام قوم اور ملک کے سر پر ہے کوئی طبقہ ایسا نہیں جس کو اس بارہ میں مستثنیٰ سمجھا جائے۔ اردو کا سب سے پہلا اور بڑا دشمن ہندو مسلمانوں کا باہمی نفاق ہے۔ ہندو کہتے ہیں کہ ہندوستان کی مادری زبان ہندی ہے۔ مسلمان کہتے ہیں کہ اردو ہے محض الفاظ نے دونوں کو مغالطہ دیا ہے۔ یہ امر نہایت افسوسناک ہے کہ مسلمان اردو میں ہندی الفاظ کی تعداد کو کم اور عربی اور مشکل فارسی الفاظ کی تعداد کو زیادہ کرتے جاتے ہیں اور ہندو ہندی سے سہل اور رائج عربی اور فارسی الفاظ کو خارج، اور غیر مانوس اور ادق سنسکرت الفاظ کو اُن کی جگہ داخل کرتے جاتے ہیں۔ اگر یہ افراط و تفریط یوں ہی جاری رہی تو اردو اور ہندی سچ مچ دو جُدا اور مختلف زبانیں بن جائیں گی۔ ہندو اور مسلمانوں کو اپنی اس غلطی پر متنبہ ہونا چاہیئے کیونکہ دونوں کی یہ نادان دوستی زبان اور ملک کے حق میں عین دشمنی ہے۔

اردو کی ترقی میں دوسرا امر مانع یہ ہے کہ علما اور قدیم تعلیم یافتہ اردو کو عربی اور فارسی کے مقابلہ میں غیر ضروری اور کم وقعت جان کر اردو کی جانب توجہ نہیں کرتے ان بزرگوں نے جہاں اردو کو اور طریقوں سے نقصان پہونچایا ہے وہیں ایک یہ بھی ہے کہ وہ عربی عبارت ہمیشہ خلاف محاورہ اردو میں ترجمہ کرتے ہیں۔ قدیم مدرسہ عربیہ دہلی، دیوبند اور تمام عربی، فارسی مدارس اور مدرسین پر کتنا بڑا الزام ہے کہ آج تک کتب تفاسیر، حدیث، فقہ، منطق، فلسفہ اور ادب کی ضروری سے ضروری کتابیں بھی عام فہم محاورہ اردو میں ترجمہ نہیں ہوئیں۔ طبیب ہندوستان میں آج تک فارسی میں نسخہ لکھتے ہیں۔

لیکن وہ گروہ جو سب سے زیادہ مورد الزام ہے جس کے افراد آنکھیں رکھتے ہیں مگر اردو پڑھنے کے لئے اندھے ہیں، کان رکھتے ہیں لیکن اردو سُننے کے لئے بہرے ہیں، زبان رکھتے ہیں لیکن اردو بولنے کے لئے گونگے ہیں، جدید تعلیم یافتہ گروہ ہے۔ تمام انگریزی مدارس، کالجوں اور یونیورسیٹوں میں تعلیم غیر زبان میں ہوتی ہے،

اُردو کی تعلیم پانچ سات ابتدائی جماعتوں کے بعد قطعاً بند ہو جاتی ہے علاوہ ازیں مضمون ریاضی، تواریخ، جغرافیہ، منطق جملہ علوم کی تعلیم انگریزی کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ جو قوم یوں اپنی زبان سے غافل ہو وہ دنیا میں کیا فروغ پا سکتی ہے۔ جس ملک کے لوگ اپنی مادری زبان کو پس پشت ڈال دیں اُس کی خاک سے بھلا کب کوئی فرزانہ اُٹھ سکتا ہے۔ جو ملت اپنی زبان کو باعثِ ننگ اور دوسروں کی زبان کو مایۂ ناز خیال کرے اُس میں کیا خودداری آسکتی ہے۔ یہ اپنی زبان میں تعلیم نہ پانے کا اثر ہے کہ ۱۸۵۷ء سے آج تک مغربی تعلیم پانے کے باوجود کوئی قومی اور ملکی نتیجہ مترتب نہیں ہوا۔ جاپانیوں نے صرف ستّر سال کی جدید تعلیم سے یورپ کی ہم نشینی کی قابلیت حاصل کرلی ہے۔ مغرب میں عورتوں کی تعلیم کو صرف چالیس برس ہوئے ہیں۔ جو لوگ کہ اب اظہارِ خیالات کے لئے غیر زبان کے محتاج ہیں اور جو آیندہ اگر یہی روش قایم رہی تو اور زیادہ دست نگر ہوں گے وہ کیا قوم و ملت کی بنیاد ڈال سکتے ہیں اُن کی زندگی ایک تقلیدِ غلامانہ اور ایک انجذاب گدایانہ ہونی ضروری ہے ہندوستان کی مختلف السنہ میں جو تنازع بقا ہو رہا ہے وہ اُردو، ہندی، بنگالی، مرہٹی، گجراتی وغیرہ زبانوں کے درمیان ہے اگر ہماری توجہ صرف انگریزی کو "میاں مٹھو" کی طرح حاصل کرنے میں ہی صرف ہوتی رہی تو اِس جہد للبقا میں اُردو آخر کب تک قایم اور زندہ رہ سکتی ہے۔ ہمارے طالب علم جو ہماری آیندہ نسل ہیں جو ہندوستان اور دُنیائے اسلام کے آیندہ وارث ہیں جن سے ہماری تمام آیندہ توقعات وابستہ ہیں جب اپنی مادری زبان سے غافل ہوکر اور اُردو کی جانب سے پشت پھیر کر رات دن کی شدید محنت اور سخت آگ اور ظالمانہ ضربات کی مدد سے انگریزی تعلیم کی زنجیر تیار کرتے ہیں تو بالآخر اِس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے جس وقت آخری کڑی وصل ہو جاتی ہے اُس وقت معلوم ہوتا ہے کہ وہ زنجیر خود اُنھیں گرفت میں لئے ہوئے ہے۔

ہمارے ملک کے نئی تعلیم پائے ہوئے اہلِ قلم انگریزی زبان میں تصنیف و تالیف کرتے ہیں، اُن کا وقت دن رات انگریزی اور مغربی علم ادب کے مطالعہ میں صرف ہوتا ہے، اُن کے کتب خانوں میں اُردو، فارسی اور عربی کتابوں کا وجود کمیاب بلکہ نایاب ہے اُن میں سے بہت کم ایسے ہیں جو اُردو ادب فارسی شاعری اور عربی علوم سے واقفیت رکھتے ہوں اور جن کو علوم مشرقیہ کی معلومات میں اضافہ کا شوق ہو گفتگو میں وہ علوم و فنون

اور حکمت کی مصطلحات پر تو کیا روزمرہ کے الفاظ تک پر قدرت نہیں رکھتے اُن کی زبان اُردو اور انگریزی الفاظ کا ایک عجیب آمیزہ ہی اُن کی تقریروں میں جس قدر ریطوریقا کا زور بڑھتا جاتا ہی انگریزی الفاظ کی تعداد میں اُس ہی نسبت سے اضافہ ہوتا جاتا ہی۔

وہ اعلیٰ ترقی جس کے ہم آرزومند ہیں اور وہ سچّی آزادی جس کی ہم خواہش رکھتے ہیں اُردو کے کفِ پا کے نیچے ہی۔ زبان وطن کا کلام ہی اور وطن کا کام وطن کے کلام سے جدا نہیں جب تک طلبا کو ہندوستان میں مادری زبان میں تعلیم نہ دی جائے گی تعلیم جزوِ حیات بن ہی نہیں سکتی اور تا وقتیکہ اُردو کو ذریعہ تعلیم نہ بنایا جائے گا اگر ہم میں سے ہر ایک کے سر میں ہزار دماغ ہوں تب بھی بیکار ہیں۔ میں پھر کہتا ہوں کہ جدید تعلیم یافتہ طوطے کی طرح آواز نگار اور صورت پرست ہیں اور اُن کا عدم اور وجود برابر ہے بلکہ اُن کا وجود عدم سے بدتر ہے۔ اگر وہ تعلیم یافتہ نہ ہوتے تو شاید قوائے جسمانی سے ہی (جن کو جدید تعلیم نے مضمحل کر دیا ہی) تنازعِ بقا میں اپنی ہستی کے قایم رکھنے کے زیادہ قابل ہوتے۔

(۲)

زبان جسم ہی اور خیالات اُس کی رُوح ہیں کسی ملک کی تہذیب کی ترقی کے لئے صرف یہ ہی کافی نہیں ہی کہ مادری زبان ذریعہ تعلیم ہو بلکہ یہ بھی ضروری ہی کہ جن مضامین میں تعلیم دی جائے وہ قومی اور ملکی ضروریات کے لحاظ سے مقرر کئے گئے ہوں۔ نصاب تعلیم کوئی ترکہ نہیں ہی جو ایک نسل سے دوسری کو وراثت میں ملتا ہو بلکہ ہر قوم اور ملک کی ہر نسل کو اپنے نصاب تعلیم کو از سرِ نو ترتیب دینا ضروری ہی۔ لیکن افسوس ہے کہ ہمارے اہلِ ملک اور اہلِ قوم اس سے واقف نہیں۔ قدیم درسگاہوں میں اب تک درس نظامیہ کی پابندی ہی اور جدید انگریزی مدارس اور کالجوں میں تمام علومِ مشرقیہ "ٹکسال باہر" خیال کئے جاتے ہیں۔ محض علوم مشرقیہ اور عربی کی قدیم تعلیم اس زمانہ میں کئی وجوہ سے غیر مفید اور نقصان دہ ہی۔ عربی تعلیم علوم جدیدہ کی واقفیت بغیر قوم کے حق میں بجائے آبِ حیات کے زہرِ ہلاہل اور نوشِ قاتل کا اثر رکھتی ہی۔ جب تک علوم مشرقیہ کا مطالعہ تنقید اور نکتہ چینی کی نگاہ سے نہ کیا جائیگا اور کھرے کو کھوٹے سے جُدا نہ کیا جائیگا علوم مشرقیہ میں جدوجہد سے بجائے آزادانہ اجتہاد کے غلامانہ تقلید اور بجائے علمی ہمت کے علمی پست ہمتی پیدا ہوگی

کون نہیں جانتا کہ علوم عربیہ اور مشرقیہ کے بہت سے حصے جدید تحقیقاتوں کی رُو سے غلط ثابت ہو چکے ہیں پس جب تک طالب علم کو یہ معلوم نہ ہو کہ وہ غلطیاں کیا ہیں اور وہ اُن سے اجتناب کر سکے، علوم مشرقیہ کی تعلیم نیم جہالت نہیں تو کیا ہے؟ ہم ایسے سیاسی اور تمدنی حالات میں گرفتار ہیں جہاں زمانے کے ساتھ ساتھ حرکت نہ کرنا موت کا مترادف ہے جسٹس امیر علی اپنی یادگار روقت تصنیف میں فرماتے ہیں:-

"جو قوم اپنے مردہ زمانۂ ماضی کو فرسودہ عبا میں ڈھانپنے کی کوشش کرتی ہے اُس کے نصیب میں اوّل ہی سے صفحۂ ہستی سے مٹنا لکھا ہے"

چوں کہ زمانہ کو محض قدیم علوم کی ضرورت نہیں یہ علوم وجہ معاش میں بھی بہت کم مدد دیتے ہیں آج کل دُنیا کی نعمتوں اور ملکی اور قومی آسائش کا مدار تعلیم جدید پر ہو گیا ہے جسٹس شاہ دین مرحوم لکھتے ہیں:-

"وجاہت ظاہری لازمی ہے۔ اسلام کوئی مٹی کی مورت نہیں بلکہ یہ مجموعہ ہے مسلمانوں کی صورتوں کا اگر مسلمانوں کی صورتیں پاکیزہ ہیں، لباس عمدہ اور شاندار ہیں، چہرے اداس نہیں بلکہ ارغوانی ہیں، بشرہ سے آثار جاہ و جلال پائے جاتے ہیں تو اسلام کی عزت ہے اور اگر وہ پھٹے حالوں میں ہیں، بھوکے پیاسے ہیں، کمزور و ناتوان ہیں اور دُنیا میں اُن کی کوئی توقیر نہیں تو اسلام کی ذلت ہے۔ دین و دُنیا کہنے کو چاہے الگ ہوں مگر در اصل لازم و ملزوم ہیں۔ بلا ترقی دُنیاوی ممکن نہیں کہ دین میں شان و شوکت پیدا ہو سکے"

لیکن جہاں قدیم تعلیم یافتہ گروہ کا قدیم علوم کو تمام جدید تحقیقات علمی سے بالا خیال کرنا بے جا ہے وہیں جدید تعلیم یافتہ گروہ کا جدید علوم کی خواہ مخواہ پرستش کرنا بھی غلط ہے۔ جدید علوم و فنون معاذ اللہ وحی خداوندی نہیں ہیں جنھوں نے قدیم علوم کا دفتر مٹا دیا ہو۔ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ مغربی علوم ہی جو جدید ہیں تحصیل کیے جانے کے مستحق ہیں اور جدید کو چھوڑ کر قدیم میں وقت صرف کرنا تضیع اوقات ہے اُن کو باوجود تعلیم پانے کے جاہل سمجھنا چاہیے۔ جس مغرب کے آستانہ پر اس خیال کے لوگ شبانہ روز سجدہ گزار ہیں وہ مشرق ہی کا ادنیٰ شاگرد ہے۔ جو بات قدیم مصری کاہن سائس نے یونانی مقنن سولن سے کہی تھی وہ نہایت سبق آموز اور ہمارے حسب حال ہے:-

"اہلِ یونان تم ہمارے سامنے بچے ہو۔ افلاطون جس پر تم کو ناز ہے ہمارے ہی مکتب کا
فرزند ہے یقیس کے دبستان ہی میں تم سب نے تربیت پائی ہے۔ تمہارا فیثاغورثی فلسفہ ہم ہی
نے تم کو تعلیم کیا ہے اور تم کو جو عقل و دانش سے عاری تھے ہم ہی نے غور و فکر کے جوہر
سے مزین کیا ہے۔ تمہارا فلسفۂ ابتہاج اور تمہارا فلسفۂ غم ہمارا ہی عطا کردہ ہے۔ ہم ہی نے
تم کو رونا اور ہنسنا سکھایا ہے۔ الف سے لے کر بے تک جو کچھ تمہارا سرمایۂ ناز ہے
ہمارا ہی دیا ہوا ہے۔"

علم فقہ کو لیجئے۔ روما کی قدیم فقہ پر آج تمام یورپی فقہ کا اساس قایم ہے۔ روما کی مشہور و معروف فقہ کی بنا
کس چیز پر قایم ہے؟ اُن کے تمام قانونی ادب میں سے ہم تک صرف چند کتابیں باندکٹ، گایوس نادل،
یسطنیان وغیرہ پہونچی ہیں اس کے مقابلہ میں اسلامی فقہ گو مذہبی مسائل سے مخلوط ہے ایک بحر ذخار ہے۔ آج
یورپ اور ایشیا کے کتب خانے ہماری فقہ کی سینکڑوں کتابوں سے بھرے ہوئے ہیں اگر روما والے دو چار
مذاہب میں تقسیم ہیں تو ہمارے فقہا میں سو مذاہب ہیں اگر کوئی خلیفۂ وقت یسطنیان کی طرح ان تمام مذاہب سے
ایک نیا مدرسہ ترتیب دینے کا حکم دے تو موجودہ زمانہ کے جدید ترین قوانین سے بہتر ایک مجموعہ قانون مدون
ہوسکتا ہے کیا عقل سلیم یہی مشورہ دیتی ہے کہ روما کی چار گنی چنی کتابوں کا مطالعہ قانونی علم حاصل کرنے کے
لئے کافی ہے اور اسلامی فقہ کی سینکڑوں کتابوں میں سے منتخب کتابوں کا مطالعہ ناکافی ہے؟ کیا عقل کا یہی
تقاضا ہے کہ مسلمان طلبا اپنے قانونی علم کی بنیاد روما کی درسیات پر رکھیں اور اسلامی کتب کو طاق نسیاں پر
ہی رہنے دیا جائے؟ روما کے قوانین کی تحقیق اور جستجو سے ہمیں کیا حاصل ہے؟ اسلامی فقہ کی چھان بین تنقید و تحقیق
سے ہم اسلامی قوانین میں ایک تازہ روح پھونک سکتے ہیں۔

فلسفہ جس کے ساتھ ہمیشہ لفظ جدید فی زمانہ کار آمد کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے نہ معلوم کن معنوں میں
نیا اور پرانا ہوسکتا ہے اور کس طرح فلسفہ مغرب کے نام سے موسوم ہوسکتا ہے۔ وحدت الوجود اور تصوف میں
آج تک عجمی مسلمانوں سے کوئی سبقت نہیں لے گیا۔ اپنشدوں کی تعلیم لافانی ہے جہاں یورپی فلسفی آکر رک
جاتے ہیں اور اپنے عجز کا اقرار کرتے ہیں وہاں ہندو فلسفی بے خوف محیط کی انتہا اور بسیط کی ابتدا تک

چلے جاتے ہیں۔

فنونِ لطیفہ میں جو قومی خصوصیات پر مبنی ہیں مغربی تقلید اگر اظہارِ جنون نہیں تو کیا ہے لیکن تمام ہندوستان قدیم سازو غنا کو ترک کر کے مغربی باجوں اور گانوں پر فدا ہے۔ سر رابندر ناتھ ٹیگور، کمار سوامی جیسے ماہرین کی رائے سے عام طور پر واقفیت تک نہیں، اُن پر عمل کیا۔ افلاطون نے اپنی کتاب جمہوریت میں بیان کیا ہے کہ غیر موسیقی کو اپنے ملک میں دخل نہ پانے دو کیونکہ یہ رفتہ رفتہ قوانین کو درہم برہم کر دیتی ہے اور تمام نظامِ قومی حتیٰ کہ آئینِ سلطنت کو تبدیل کر دیتی ہے اور ملّت کے شیرازہ کو پراگندہ کر دیتی ہے۔ کچھ موسیقی پر موقوف نہیں جہاں حقیقی لذّتِ گوش نہیں وہاں ذوقِ بصر بھی مفقود ہے۔ صنم بازی اور مصوّری میں ہمارے نوجوان جدید تعلیم یافتہ اُن مجسّمات اور تصاویر کو دیکھکر جو عکّاسی کے درجہ سے بہت کم بلند ہیں بے خود ہو جاتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ قدیم یونانی اور جدید اطالوی احیاء کے بعد کا فن جس پر وہ جان دیتے ہیں مصر، اسیریا، اور قدیم ہند کے فن کی گرد کو بھی نہیں پہونچتا۔ اجنتا کے غاروں میں جو تصویریں ہیں اور اُن میں جو رنگ ہے تمام یورپ کے نگارخانوں میں بھر جائے وہ رنگ کسی مصوّر کے موقلم نے نہیں دکھلایا۔ نٹ راجہ یا گیانی بدھا سے ملکوں کی زہرہ کو کچھ نسبت نہیں لیکن ہمارے بہت سے جدید تعلیم یافتہ جو یونانی زندگی میں زہرہ کی حیثیت سے بھی واقف نہیں اور اُس کو محض ایک بازو شکستہ عُریاں عورت کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اُس پر غش ہیں حق یہ ہے کہ فدیئش اور پالگ ناطس، ہندوستان، مصر اور اسیریا کے قدیم اہلِ فن کی شاگردی کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتے۔

(۴)

علوم کی حالت جامد اجسام کی سی نہیں جو ایک دوسرے کا جزوِ بدن نہیں ہو سکتے بلکہ پودوں کی سی ہے جن میں باہم پیوند لگایا جا سکتا ہے۔ ہندوستان کے علمی احیاء کے لئے لازمی ہے کہ علومِ مشرقیہ کی شاخِ کہنہ میں علومِ جدیدہ کی قلم لگائی جائے۔ ضرورت اِس امر کی ہے کہ ایشیائی قدیم نقطۂ نظر اور یورپی جدید نقطۂ خیال کا اجتماعِ سعدین ہو تاکہ ہمارے اسلاف کے علوم و فنون جو بقول مولانا نذیر احمد خدانخواستہ بے جان اور مُردہ نہیں ہو گئے بلکہ صرف ٹھٹھر گئے ہیں پھر تندرست اور توانا ہو جائیں یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ علومِ

مشرقی کے سردجسم میں علومِ مغربی کا گرم خون پہونچایا جائے۔ اِس عظیم الشّان مقصد کی تکمیل کا ذریعہ صرف ایک ہی اور وہ یہ ہے کہ علوم مغربیہ اور علوم مشرقیہ کا مطالعہ ہم پہلو اور ساتھ ساتھ کیا جائے تاکہ دونوں کے باہم نقّادانہ مطالعہ سے دونوں کے بہترین حصص خود بخود رفتہ رفتہ یکجان ہوجائیں اور ایک نئی ہندوستانی تہذیب کی عبارت اور ترتیب کا ذریعہ ہوں۔"

اگر ہم اپنی ہستی برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ اپنے فلسفہ، اپنی طبّ، اپنے فنون، اپنی فقہ، اپنے علوم اور اپنی حکمت کو زندہ کریں اگر ہمارا از کار رفتہ مشرقی فلسفہ مغربی فلسفہ کے اختلاط سے اپنے رطب و یابس سے پاک ہوجائے تو وہ یقیناً ہماری تعلیم کا ضروری جزو بننے کی قابلیت رکھتا ہے اگر ہمارے فنون لطیفہ (جن کی بنیاد روحانیت پر ہے) مغربی فنونِ لطیفہ کے اصول پر غور کے بعد وسیع تر بنیاد پر قایم کئے جائیں تو کوئی شک نہیں کہ یورپ اور ایشیا دونوں کے موجودہ فنون سے زیادہ عظیم الشان فنون کی بنیاد قایم ہوسکتی ہے۔ اگر ہم مغربی فقہ کے مطالعہ کے بعد کامل غور و خوض کو کام میں لاکر اپنی قدیم فقہ کی تنقیدی نظر سے دوبارہ تدوین کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم بھی مثل اہلِ روما یا جدید اقوام کے ایک یادگار زمانہ جدید قانون اسلامی کے بانی نہ ہوں؟ ہمارے اسلامی اور ایشیائی علوم ہی ہماری ملّت اور قومیت کی اصلی بنیاد ہیں اگر ان کا احیاء نہ ہوا تو ہم دنیا میں فقط یورپ کی ایک پژمردہ نقل بن کر رہ جائیں گے جس کی یورپ کو کوئی ضرورت نہیں اور زمانہ ہمارے نام کو مٹا دے گا لیکن اگر ہم نے علوم شرقیہ اور غربیہ کی تعلیم پہلو بہ پہلو رائج کرنے کے طریقہ کو اختیار کیا تو یقیناً بیس برس کے اندر اندر ایسی تصانیف اور تحقیقاتیں ہم سے ممکن ہوں گی جن کی یورپ قدر کرے گا اور جو دنیا کے علم میں اضافہ کا باعث ہوں گی۔

(۴)

قدیم علوم کی قریب قریب تمام کتابیں عربی میں ہیں جدید علوم کی کتابیں یورپ کی مختلف زبانوں میں ہیں اردو میں نہ قدیم مشرقی علوم کی کتابیں ترجمہ ہوئی ہیں نہ جدید مغربی علوم کی ہم بحیثیت ہندوستانی ہونے کے اپنی مادری زبان اردو میں نہ قدیم یونانی علوم کے (جن کو مسلمانوں نے اختیار کیا اور فروغ دیا تھا) اور نہ موجودہ یورپی علوم کے ہی (جو اِس وقت تمام دنیا کی زبانوں میں شایع ہیں) مالک ہیں۔

بعض اشخاص ایک نہایت غلط دلیل عربی کو قدیم علوم اور انگریزی کو جدید علوم کے حاصل کرنے کا ذریعہ قرار دینے کے متعلق یہ دیتے ہیں کہ ہر علم کو اُس کی مخصوص زبان میں حاصل کرنا چاہیئے۔ اُن کی رائے میں جو مضامین عربی کتابوں میں ہیں وہ عربی ہی میں مطالعہ ہو سکتے ہیں اور جو انگریزی کتابوں میں ہیں وہ انگریزی ہی میں پڑھائے جا سکتے ہیں لیکن یہ خیال غلط ہے۔ علم ہرگز جغرافی سرحدوں سے محصور نہیں ہے۔ ہر زبان کی مثال ایک خارجی ظرف کی سی ہے اور علم جو مظروف ہے کسی خاص ظرف کا پابند نہیں جیسے پانی کو جس وقت چاہیں ایک برتن سے دوسرے میں منتقل کر سکتے ہیں بعینہٖ اسی طرح ہر علم کو ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کر سکتے ہیں اگر اس اصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ علوم کا مطالعہ اصل زبانوں میں کرنا چاہیئے تو علوم جدیدہ کی ہر شاخ کے جاننے کے لئے ضروری ہوگا کہ یورپ کی کم از کم سات زبانوں سے واقفیت ہو۔ فی زمانہ کسی جدید معرکتہ الآرا بحث کو لے لیجئے خواہ وہ فلسفہ میں ہو یا حکمت میں کسی جدید مسئلہ پر غور فرمایئے خواہ علوم سے متعلق ہو یا فنون سے کسی جدید اصول یا اکتشاف یا اختراع پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ کوئی مغربی ملک ایسا نہیں ہے جہاں متعدد ماہرین نے اُس کے متعلق نہ لکھا ہو اور اپنی معلومات سے اُس میں اضافہ نہ کیا ہو اس لئے فی زمانہ ہر مضمون سے ایک یا دو چار مغربی زبانیں جاننے پر بھی واقفیت محض ناممکن اور قطعی محال ہے جب تک زیادہ تر تراجم سے کام نہ لیا جائے۔

آج مغرب میں کوئی بھی ملک ایسا نہیں ہے جہاں تعلیم و تربیت کا ذریعہ تراجم اور فقط تراجم نہ ہوں علوم صیحہ کی تعلیم بغیر تراجم ہو ہی نہیں سکتی علم اور حکمت کی کوئی شاخ ایسی نہیں ہے جس کے مطالعہ کے لئے تراجم کی احتیاج نہ ہو اگر کوئی شخص آج اصل زبان کو ذریعۂ تعلیم قرار دے کر (بطور مثال) صرف جدید فلسفہ سے واقف ہونا چاہے تو اُس کے لئے ضروری ہے کہ وہ کم از کم بیکن، برؔدنو وغیرہ سے واقف ہو جن کی اصل تصانیف لاطینی میں ہیں، دے کارؔ، کامتؔ، روسوؔ وغیرہ سے واقف ہو جن کی اصل تصانیف فرانسیسی میں ہیں کانٹؔ، ہیگلؔ، فشتےؔ، شلینگؔ، نطشےؔ وغیرہ سے واقف ہو جن کی اصل تصانیف جرمن میں ہیں۔ اسپی نوزا سے واقف ہو جس کی اصل تصانیف ڈچ زبان میں ہیں کروچےؔ وغیرہ سے واقف ہو جن کی اصل تصانیف اطالوی زبان میں ہیں وعلیٰ ہٰذالقیاس۔ تمام جدید فلسفہ سوائے برکلےؔ، مِلؔ، اسپنسرؔ وغیرہ کے غیر انگریزی یورپی زبانوں میں ہے اگر صرف

اصل زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کی کوشش کی جائے تو علمی دُنیا میں قیامت برپا ہو جائے اور تمام علمی تحقیقاتیں ایک دن میں بند ہو جائیں۔

علوم وفنون کی اُن کتابوں میں جو ادب اور معانی سے تعلق نہیں رکھتیں قریب قریب جملہ مضامین میں ترجمہ اور اصل کتاب میں کوئی فرق نہیں ہوتا بلکہ میں یہ کہوں گا کہ چوں کہ مصنفین ماہرین ہوتے ہیں اور تمام عمر ایک مضمون کی تکمیل میں صرف کردینے کے باعث ادب کی طرف توجہ کرنے کی فرصت نہیں رکھتے اپنے مطالب کو فصاحت اور بلاغت سے اکثر بیان نہیں کرسکتے اور مترجم جو عموماً ادیب ہوتے ہیں اپنے ترجمہ کو اصل کے ان اسقام سے پاک کردیتے ہیں اور ترجمے بعض اوقات اصل سے بہتر ہوتے ہیں۔

ہندوستان کی موجودہ علمی حالت خود اِس امر کی متقاضی ہی کہ اہلِ قلم ترجمہ کے کام کی طرف توجہ کریں۔ ہر ایک قوم کی زندگی میں ایک وقت ایسا آتا ہی جب تاریخی اور سیاسی اعتبار سے علوم وفنون کی روشنی کم ہوجاتی ہی اور اِس بات کی ضرورت ہوتی ہی کہ وہ اپنے چراغ کو اور اقوام کے چراغ سے روشن کرے۔ اِس زمانہ میں آفرینش کی قوت زائل ہوجاتی ہی۔ جو تصنیفات ہوتی ہیں وہ ادنیٰ درجہ سے آگے نہیں جاتیں اِلّا ماشاءاللہ عوام کا مذاق درست نہیں رہتا ایسے زمانہ میں ضروری ہی کہ کتابوں کے لکھنے والے بجائے اِس کے کہ خود اپنے خام یا نیم پختہ خیالات کا اظہار کریں دُنیا کے گذشتہ اور موجودہ مصنفین کے ترجمان ہوجائیں۔ گو ہم میں ہر شخص اِس بات کا مشتاق ہی کہ وہ خود مصنّف ہو اور مترجم یا مؤلف ہونا اپنی کسرِ شان تصوّر کرتا ہی مگر یہ خیال غلطی پر مبنی ہے آج یورپ میں مترجم بھی وہی پایہ اور درجہ رکھتے ہیں جو خود مصنف رکھتے ہیں انگریزوں میں ولیم آرچر موجودہ مشہور نقّاد اور ادیب کی شہرت اِس بنا پر قایم ہے اور ہمیشہ رہیگی کہ وہ ابسن ناروے کے ڈراما نویس کا مترجم ہی۔ رکرٹ جس نے دیوان حماسہ کا ترجمہ کیا ہی شعراءِ جرمنی میں ممتاز پایہ رکھتا ہی۔ اسٹیفان گیارگے المانی شاعر سون برن کا مترجم ہونے کی حیثیت سے معروف ہی۔ ہمارے ملک میں جو حالت آج ہی وہ اِس امر کو چاہتی ہے کہ ترجمہ اور تالیف کو تصانیف پر ترجیح دی جائے۔ سوائے معدودے چند لوگوں کے جن کو قدرت نے اعلیٰ ترین دماغوں سے مزین کیا ہی اور اپنے خاص پیغام پہونچانے کے لئے مقرر فرمایا ہی ہمارے ملک وقوم کے بیشتر لوگوں کو چاہیئے کہ مشرقی اور مغربی

زبانوں سے ترجمہ کی جانب توجہ کریں۔

جن لوگوں نے ترجمہ کے کام کو کیا ہی اُن کو یہ شکایت ہی کہ مصطلحات کی تلاش اور ایجاد میں سخت مشکل پیش آتی ہی۔ میری رائے میں یہ اشکال خود ہی ترجمہ کے کام کو زیادہ قابلِ عزت اور وقعت بنا دیتا ہی کیوں کہ اس قسم کی مشکلات کو حل کر کے مترجم زبان کی عمارت کے اساس کو قایم کرتا ہی اور آیندہ نسلوں کے واسطے زبان کی ترقی کے راستہ کو صاف کرتا ہی۔

مصطلحات علمیہ کے متعلق بعض کا خیال ہی کہ اُن کے انتخاب یا وضع کرنے والے ماہرین ہونے چاہئیں یعنی جس علم و فن کی مصطلحات مطلوب ہوں اُن کو اُس ہی علم یا فن کے ماہرین بنائیں لیکن یہ درست نہیں ہمارے اکثر انگریزی یونیورسٹیوں کے ہندوستانی پروفیسر جو علوم جدیدہ کی تعلیم دیتے ہیں اپنی زبان میں مصطلحات سے بہت کم واقف ہیں بلکہ خود انگریزی زبان میں بھی علم اللسان کے نکتہ نظر سے یونانی اور لاطینی مصطلحات کے معنی نہیں جانتے۔ جدید علوم و فنون کی مصطلحات اور علمی لغات یورپ کی زبانوں میں زیادہ تر لاطینی اور یونانی الفاظ سے مرکب ہیں اور ہماری زبان میں عربی یا فارسی یا ہندی رائج ہوسکتی ہیں حاصل کلام اُردو زبان کی اِس خدمت کے لئے ایک ایسی جماعت کے تیار کرنے کی ضرورت ہی جس میں ماہرین کے علاوہ عربی، فارسی، یونانی، لاطینی، انگریزی، فرینچ اور جرمن کے جاننے والے موجود ہوں

بعض مشرقی اقوام نے جن میں میں ترکوں کی مثال پیش کرتا ہوں انگریزوں کی طرح بہت سی جدید مصطلحات علمیہ کو (مثلاً آکسیجن ہائیڈروجن وغیرہ) ویسے کا ویسا ہی اپنی زبان میں لے لیا ہی یہ محض اُن کی پست ہمتی اور نارسی کی دلیل ہی انگریز تو یونانی اور لاطینی مصطلحات کو اختیار کر چکے اور وہ اُن کی زبان کا جزو ہوچکیں لیکن ہمارے لئے ابھی انتخاب کا موقع باقی ہی ایسی صورت میں جب کہ یہ بات یکساں ہمارے بس میں ہی کہ چاہیں تو یونانی اور لاطینی الفاظ اور مصطلحات کو لے لیں اور چاہیں تو خود اپنی زبان میں ترجمہ کرلیں ہمارا انگریزوں کی تقلید کرنا سخت غلطی ہوگا۔ جرمنوں نے جو علمی حیثیت سے ایک نئی قوم ہیں ایسا نہیں کیا بلکہ سب مصطلحات کو اپنی زبان میں ترجمہ کرلیا ہی۔

ہم کو چاہیئے کہ تمام علوم و فنون کی مصطلحات کو اپنی قدیم اُردو فارسی اور عربی زبانوں کی کتابوں میں

تلاش کریں بہت سے علمی لغات موجود ہیں مگر پرانی کتابوں میں دبے پڑے ہیں ان بے بہا موتیوں کو ان تاریک گہرائیوں میں سے نکالنا چاہیئے سائنس کی مصطلحات بھی بہت سی موجود ہیں صرف ان کو تلاش کر کے رواج دینے کی ضرورت ہے۔ نباتیات کی بہت سی مصطلحات میزان الادویہ میں مل سکتی ہیں۔ کیوں کہ ہماری طب کی تقریباً تمام ادویہ نباتی ہیں اگر الفاظ نہ مل سکیں تو ان کو خود بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے اس کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ انگریزی یا جس یورپی زبان کا لفظ ہو اس کے اجزا کی تحلیل کر لینی چاہیئے اور پھر اس کے لاطینی یا یونانی وغیرہ مادہ کے لحاظ سے اس کا ترجمہ کرنا چاہیئے۔

مثالیں

	Phono	graph
Phono-graph	آواز	نگار
	Tele	phone
Tele-phone	دور	گو
	Fern	sprecher
Fernsprecher (جرمنی میں اسی لحاظ سے)	دور	گو کہتے ہیں
	Auto	mobile
Auto-mobile	خود	رواں
	Tele	scope
Telescope (پہلے سے موجود ہے)	دور	بین

پس کام اتنا مشکل نہیں جیسا نظر آتا ہے۔

ترجمہ کرنے میں تین مختلف طریقے اختیار کئے جا سکتے ہیں ایک یہ کہ عربی دوسرے یہ کہ فارسی تیسرے یہ کہ ہندی مصطلحات وضع کی جائیں۔ عربی الفاظ کو ترجیح دینے والے یہ وجوہ پیش کرتے ہیں کہ عربی زبان میں تمام علوم و فنون کی مصطلحات موجود ہیں جو صرف مرور زمانہ سے غیر مستعمل ہو گئی ہیں ان کو تلاش کر کے دوبارہ زندہ کرنا کافی ہے وہ کہتے ہیں کہ اس طریقہ کو اختیار کرنے سے دس بارہ برس میں علوم قدیمہ اور جدیدہ میں اتصال پیدا ہو جائے گا علاوہ ازیں اہل بیروت اور اہل مصر نے جو جدید مصطلحات وضع کر لی ہیں وہ ہمارے کام آ سکتی ہیں اور بہت سی محنت بچ سکتی ہے لیکن میری رائے میں اردو کے لئے بعض طرح انگریزی لاطینی یا یونانی مصطلحات

کا اختیار کرنا غلط ہے عربی مصطلحات کا اختیار کرنا بھی درست نہیں۔ عربی مصطلحات کے اختیار کرنے سے
وہی قباحت جو انگریزوں کو لاطینی مصطلحات کی وجہ سے عارض ہے باقی رہتی ہے اور وہ آسانی جو جرمنوں کو
خاص جرمن مصطلحات سے حاصل ہے پیدا نہیں ہوتی لغات علمیہ کی خوبی یہ ہے کہ ہر شخص اُن کو آسانی سمجھ لے
اگر اُردو میں ایسی مصطلحات کو رواج دیا جائے جن کا مفہوم پانے کے لئے اوّل عربی زبان کا سیکھنا لازم ہو
تو یہ لغات کسی طرح ہماری زبان اور ہمارے ملک کے لئے موزوں نہیں ہو سکتے۔ عربی لغات اختیار کرنے میں
یہ مشکل ہے کہ وہ عام فہم نہیں ہیں دریافت کرتا ہوں کہ کون شخص ایسا ہے جو عربی زبان جانے بغیر ذیل کے الفاظ
کے معنی سمجھ سکتا ہے۔

کثیرۃ الرجل ۔ اخطبوطیہ ۔ شوکیۃ الجلد ۔ مستعلج الجلد ۔ سلحفیہ ۔ مستقیم الاجنحہ ۔ اِس سے تو کہیں بہتر
ہے کہ انگریزی مصطلحات ہی بجنسہٖ اختیار کر لی جائیں کیوں کہ گو ایسا کہنا کوئی فخر کا باعث نہیں لیکن ہمارے
ملک کے لوگ انگریزی مصطلحات سے کم از کم ان عربی مصطلحات کی نسبت زیادہ واقف ہیں۔ ہندی الفاظ اور
مصطلحات اختیار کرنے میں یہ دقت ہے کہ لطافت زبان بالکل جاتی رہتی ہے۔

مثال

ہندی لفظ

روکڑ — سرمایہ — Capital

ایک منطق کے رسالہ میں Contrary (نقص اجمالی) Contradictory (نقص تفصیلی) کا ترجمہ
آدھا توڑ اور پورا توڑ کیا گیا ہے۔

میری رائے میں فارسی زبان کو اِس بارہ میں عربی اور ہندی زبانوں پر ترجیح ہے۔ میرا ناچیز خیال یہ ہے
کہ ہم کو افراط اور تفریط سے بچنا چاہیئے اور سب سے اوّل جہاں فارسی مصطلحات موزوں بن سکیں اُن کو سب پر ترجیح
دینی چاہیئے اس کے بعد عربی قدیم مصطلحات کو جو مفرد یا مانوس الاستعمال الفاظ کی صورت میں ہوں اختیار کرنا
چاہیئے ایسے الفاظ سے جو ہماری زبان کے لحاظ سے سخت یا وزنی ہوں اجتناب کرنا چاہیئے۔ فارسی زبان کو

مصطلحات وضع کرنے کے لحاظ سے جو خاص موزونیت حاصل ہے اُس کو نہایت آسانی سے ثابت کیا جا سکتا ہے۔

اوپر جو عربی مصطلحات کی مثالیں بیان ہوئی ہیں اگر اُن کی بجائے فارسی مصطلحات وضع کی جائیں تو فارسی کی فوقیت عربی پر خود بخود عیاں ہو جائے گی کون ایسا شخص ہے جو مفصلہ ذیل مصطلحات کے معنی نہیں سمجھ سکتا؟

کثیر پا - خار پشت - گداز جلد - غلاف پوش - راست پر - فارسی زبان میں جرمن کی طرح یہ خوبی ہے کہ جن دو لفظوں کو چاہیے فوراً ملا کر مرکب لفظ بنا لیجئے مصطلحات کے لئے ایسی زبان سب سے زیادہ موزوں ہے عربی میں یہ بات نہیں ہماری زبان میں عربی مصطلحات ذرا ثقیل بھی معلوم ہوتی ہیں۔

ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ آیا مصطلحات کی لغت پہلے تیار ہونی چاہیئے یا پہلے مختلف مضامین کی کتابیں لکھی جائیں اور اُن میں حسب ضرورت مصطلحات وضع کر کے داخل کی جائیں اور پھر جب رفتہ رفتہ اِس میں ترقی ہو تو تمام مصطلحات کو یکجا جمع کر کے لغت تیار کی جائے۔ لغت کی تقدیم کے مخالفین کہتے ہیں کہ اگر لغت پہلے سے تیار ہوئی تو وہ ناقص ہوگی اور اس طرح ناقص مصطلحات رواج پا جائیں گی بدیں وجہ لغت میں صرف اُنھیں الفاظ کو جگہ دینی چاہیئے جو وقت کی کسوٹی پر کسے جانے کے بعد مقبول عام ہو جائیں ہم اِس تقدیم اور تاخیر کا قائل نہیں لیکن لغت کوئی زبان کی ٹکسال نہ ہوگی کہ اُس کی تدوین کے بعد مصنفوں مؤلفوں اور مترجموں کو کوئی مصطلحات جو ٹکسال باہر ہوں لکھنے کی اجازت نہ ہوگی اور جو لفظ لغت میں جن معنی میں استعمال ہوگا اُس کو سب کو قبول کرنا پڑے گا۔ ایسا خیال درست نہیں جو اشخاص اِس وقت ایسی لغت ترتیب دے رہے ہیں اُن کا منشا صرف اتنا ہے کہ وہ مصنفوں، مؤلفوں یا مترجموں کی امداد کی غرض سے اپنی لغت میں امتحان اور آزمائش کے لئے الفاظ پیش کریں اور مصنف مؤلف اور مترجم اُن کی محنت سے مستفید ہوں اُن مصطلحات کی پابندی کسی پر لازمی نہ ہوگی بلکہ مصنفین مؤلفین اور مترجمین کا فرض ہوگا کہ وہ مصطلحات مندرجہ لغت میں اصلاح ترمیم اور قطع و برید کرتے رہیں یوں یہ کتاب لغت حقیقت میں ایک ابتدائی خاکہ ہوگی اور مذاق سلیم رکھنے والے اہل قلم اِس کے مندرجہ الفاظ میں برابر ردّ و بدل کرتے رہیں گے۔ اگر اسی طرح دونوں فریق ایک دوسرے کے مشیر اور معاون رہے تو دس بارہ برس میں ایک مستند لغت بھی تیار ہو جائے گی اور وہ وقت آ جائے گا کہ الفاظ کے معنی کو مقرر کر دیا جائے۔

اکثر یہ دریافت کیا جاتا ہی کہ جدید مصطلحات کی لغت کی کتابیں ترکی عربی فارسی میں موجود ہیں یا نہیں! میں نے اِس کے متعلق جہاں تک واقفیت بہم پہونچائی ہی وہ یہ ہے کہ ۱۸۷۴ء میں طہران میں ایک کتاب فرانسیسی زبان میں شائع کی گئی ہی جس میں علم الانسان اور طبِ مغربی کی مصطلحات فرانسیسی۔ انگریزی المانی اور فارسی میں درج ہیں اِس کے علاوہ فارسی زبان میں جدید مصطلحات کی کوئی لغت نہیں۔ عربی میں بیروت میں چند کتابیں طبع ہوئی ہیں لوئس معلوف نے ایک لغت عربی الموسوم بہ المنجد ۱۹۰۸ء میں شائع کی ہی اِس میں الفاظ کے معنی عربی سے عربی میں درج ہیں اور سائنٹفک اور ٹیکنکل مصطلحات بھی شامل ہیں۔ ایک اور مفید لغت جس میں بعض انگریزی مصطلحات کے عربی مرادف الفاظ موجود ہیں ابکاریوس ۱۸۹۳ء کی ہی۔

مصر میں ایک لغت اسپیرو کی ہی جو قاہرہ سے ۱۸۹۷ء میں شائع ہوئی ہے پراٹسٹنٹ کالج بیروت نے جدید علوم کی مختلف شاخوں پر تیس چالیس برس کا عرصہ ہوا ابتدائی کتب لکھوائی ہیں اِن سے بھی مدد مل سکتی ہی لیکن بہت کم۔

دائرۃ المعارف البستانی بھی اِس نکتۂ نظر سے قابل توجہ ہی۔ پُرانی کتابوں میں الخوارزمی کی مفاتیح العلوم اور ایسی ہی بیسیوں کتابیں لائق غور ہیں اِن میں سے بہت سے مصطلحات تلاش ہوسکتی ہیں جن کو رواج دینا ممکن ہی۔ ایک اور کتاب جس کی تعریف میں نے سُنی ہی اور جو غالباً ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں موجود ہی۔

A[1] dictionary of the Technical terms used in the Sciences of the Mohammedans.

ناگری پرچارنی سبھا اور گروکل ہردوار کی کتابیں اور درسیات بھی توجہ کے لائق ہیں۔

---

[1] غالباً ڈاکٹر صاحب مرحوم کی مراد فاضل تھانوی کی کتاب سے ہی۔ (اڈیٹر)

بنگالی زبان پر مُسلمانوں کے اِحسانات

(از جناب حامد جمال صاحب سابق مدیر مُساوات مرحوم)

جناب حامد جمال صاحب نے ہندوستان کے نامور نغمہ سنج ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کی تصانیف سے ایک اچھّا انتخاب کر کے اِس کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اِس پر انھوں نے ایک مقدمہ لکھا ہے اور شاعر کے کلام پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ اس دیباچہ کا ایک حصّہ یہ مضمون ہے۔ یہ کتاب ابھی تک طبع نہیں ہوئی۔ چوں کہ اِس مضمون میں فاضل مضمون نگار نے بڑی تحقیق سے کام لیا ہے اور بنگالی زبان سے مسلمانوں کا جو تعلق ہے اُسے ایسی خوبی اور وضاحت سے بیان کیا ہے جو اب تک کسی نے بیان نہیں کیا تھا، اِس لئے مَیں نے اُردو میں اس کا شائع کرنا مناسب سمجھا۔ مضمون درحقیقت پڑھنے اور داد دینے کے قابل ہے۔ اڈیٹر

بنگالی زبان قدیم پراکرت کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ پراکرت کے قواعد اب بھی اِس زبان میں مروج ہیں۔ بدھ مت کے پیرووں نے دسویں صدی کے آخر میں اِس زبان کو جو اُس وقت گوڈا[1] پراکرت کہلاتی تھی ادبی شان دینی چاہی اور اِس زبان میں کتابیں تصنیف کرنی شروع کیں مگر ہندوؤں کے دَوْر دَوْرے میں یہ پسْ کردہ گئی۔ سچ تو یہ ہے کہ ہندوؤں کا فلسفۂ نفرت ہی ان کی بقا کا اہم راز ہے۔

منو جس کے جغرافیہ کے مطابق بنگال آریہ ورت کا ایک حصّہ تھا اپنے ہم مذہبوں کو اِس صوبہ سے الگ رہنے کی ہدایت کرتا ہے اور یہاں کے لوگوں سے تعلقات قایم رکھنے کی ممانعت۔ اننت ترتھا نے اِس ملک کو راکشسوں کا دیس کہا ہے اور یہ صرف اِس لئے کہ یہاں کے باشندے مگدھ کی نسل سے تھے اور برہمنوں کا زور بہت دنوں اس ملک پر چل نہ سکا اور نہ ان کی سنسکرت کو کوئی عُروج حاصل ہوا۔ کرشن پنڈت نے جو بارھویں صدی میں گذرا ہے

---

[1] گوڈا بنگال کو کہتے ہیں

گوداپراکرت کو بھوتوں کی زبان قرار دیا ہے۔ ہندوؤں نے اِس زبان کی مکمل بربادی کا تہیّہ کر لیا تھا اور اِس کو ملیامیٹ کر چکے تھے جس کے ثبوت میں سنسکرت کا یہ مشہور قطعہ کافی ہے۔

"جو شخص اٹھارہ پرانوں یا رامائن کی داستانوں کو بنگالی زبان میں بیان ہوتے سُنتا ہے
وہ بدترین دوزخ میں جھونکا جائے گا"

اِس صورت میں کس کو اُمید موہوم بھی ہوسکتی تھی کہ یہ زبان زندہ بچے گی اور سرسبز ہوگی؟ اِس لئے کہ علاوہ برہمنوں کی دشمنی کے یہ راجاؤں مہاراجاؤں کی سرپرستی سے بھی محروم تھی اور تمام درباروں میں وکرماجیت کے وقت سے یہ قاعدہ چلا آرہا تھا کہ سنسکرت کے ناظم و ناثر زینت دربار ہوتے تھے۔ مگر انسانی قوت قدرت کی مشیّت میں رکاوٹ نہیں پیدا کرسکتی۔ وہ زبان جو گلی کوچہ کی عامیانہ زبان ہوکر رہ گئی تھی اِس کی اعانت مسلمانوں کے سُپرد کی گئی اور انھیں کے ہاتھوں یہ اس قدر عروج کو پہونچی کہ دورِ حاضرہ میں اہلِ علم جرمنی سے اس کے مشتاق ہوکر آئے۔ مسلمان چوں کہ دلوں پر حکومت کرنا چاہتے تھے اِس لئے جب تک وہ فاتحانہ مغائرت کو دُور نہ کرتے یہ مقصد نہیں حاصل ہوسکتا تھا اِس کے لئے لازم تھا کہ وہ یہاں کے باشندوں کی زبان سیکھیں اُس کی قدر افزائی کریں تاکہ رعایا کے رسم و رواج اور جذبات کا صحیح اندازہ ہوسکے۔ مسلمانوں نے سب سے پہلے ہندو مذہب کی دونوں مشہور اور متبرک کتابوں کا ترجمہ بنگالی زبان میں کرایا۔ اور اِس کا سہرا ناصر شاہ کے سر ہے جس کی شان میں شاعر ودیاپتی نے جس نے سلطان غیاث الدین کی بھی بہت تعریف کی ہے۔ متعدد قصیدے کہے ہیں اور اِس کی عدل گستری اور رعایا پروری کی تعریف کرتے ہوئے اِس کو محبت کا دیوتا قرار دیا ہے۔ یہ نسخہ اب تک دستیاب نہیں ہوا ہے مگر اِس کا حوالہ دوسرے ترجمہ میں جو حسین شاہ کے عہد میں ہوا متعدد جگہ آیا ہے۔ حسین شاہ بنگالی زبان کا بڑا دلدادہ تھا اس نے اپنے معزز درباری مُلّادھرواسو کو بھاگوت کا بنگالی میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا جس کے دو باب تیار ہوجانے پر سلطان نے اِس کو گن راج خان کا خطاب عطا فرمایا۔ حسین شاہ نے اپنے جنرل پیر گل خاں گورنر چٹاگانگ کے تحت میں مہابھارت کا ترجمہ کرایا۔ کوندر پرمیشور جس سے پیر گل خاں نے مہابھارت کا ترجمہ کرایا حسین شاہ کی تعریف میں یوں گویا ہوتا ہے۔

"بادشاہ ایک روشن دماغ اور اولوالعزم آدمی تھا۔ پانچوں "گوڑ"[1] کے لوگ اِس کی تعریف میں

---

[1] سوارستوتا یعنی پنجاب۔ کنیا کوجا یعنی قنوج۔ گوڑ یعنی بنگال۔ متھیلا یعنی دربھنگا۔ اور اتکلا یعنی اڑیسہ۔ یہ سب مل کر پانچ گوڑ کہلاتے ہیں

رطب اللسان تھے۔ وہ فن سپہگری کا ماہر اور کلجگ میں مثل دوسرے کرشن کے تھا۔"

سری کرن نندی جس نے پیرگل خاں کے وفات کے بعد بقیہ حصّہ مہا بھارت کا ترجمہ کیا حسین شاہ کے بارے میں یوں کہتا ہے:۔

"حسین شاہ ایک زبردست بادشاہ تھا اور مثل دوسرے رام کے سلطنت کرتا تھا۔ وہ دنیا پر صلح و آشتی، سلوک اور سزا اور اپنے دشمنوں میں تفرقہ اندازی سے حکومت کرتا تھا۔"

سری کرن نندی نے ایک دوسرے مقام پر چھوٹے خاں ولد پیرگل خاں کی ان الفاظ میں تعریف کی ہے:

"وہ جنگ کے وقت بپھرا ہوا شیر ہے۔ وہ مثل ہاتھی کے نہایت وقار سے چلتا ہے۔ اس میں چونسٹھ اوصاف ہیں اور خدا نے اس کو عالمگیر شہرت دی ہے۔ بلند خیالی اور سخاوت میں وہ ولی اور کرن کا مقابلہ کرتا ہے۔ فن سپہگری اور قوت بازی میں اس کا کوئی مثل نہیں ہے۔"

رامائن کا سب سے عمدہ ترجمہ کرتیواس نے کیا ہے اور اس کی مقبولیت کی کھلی ہوئی دلیل یہ ہے کہ پانچسو برس کے بعد بھی آج ہر سال اس کی لاکھوں کاپیاں بنگال میں فروخت ہوتی ہیں۔ کرتیواس نے اپنی زندگی کے نہایت مختصر حالات چھوڑے ہیں۔ مگر افسوس یہ ہے کہ اس نے کہیں اپنے اس مربی بادشاہ کا نام نہیں لکھا ہے جس کے حکم سے اس نے رامائن کا ترجمہ کیا اور جس کی قدرافزائی سے اس کی شہرت میں چار چاند لگ گئے۔ وہ اپنے تذکرہ میں لکھتا ہے:۔

"اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد میں گوڑ کے بادشاہ کے دربار میں حاضری کا طالب ہوا اور پانچ اشعار اس کی خدمت میں لکھ بھیجے۔ میری درخواست منظور ہوئی اور بادشاہ نے مجھکو باریاب کیا۔ بادشاہ کا دربار مثل دیوتاؤں کے سبھا کے منوّر تھا اور میں اس منظر کو دیکھکر ششدر رہ گیا بادشاہ خوش و خرّم تھا اور سربرآوردہ لوگ اس کے گرد کھڑے تھے۔ محل کے مختلف حصّوں میں ناچ گانا ہو رہا تھا اور لوگ تیزی سے اِدھر اُدھر آجا رہے تھے۔ صحن میں سُرخ قالین بچھا تھا اور اس پر ایک غالیچہ پڑا تھا۔ خوبصورت ریشمی شامیانے کے نیچے بادشاہ ماگھ کے مہینے کی ہلکی دُھوپ کا لُطف اُٹھا رہا تھا۔ میں بادشاہ سے فاصلہ پر جا کھڑا ہوا لیکن بادشاہ نے مجھے

قریب آنے کا حکم دیا۔ میں نے سات اشعار سنسکرت میں سُنائے۔ بادشاہ نے غور سے سُنا اور
بہت محظوظ ہوا۔ کدار خاں نے میرے اوپر گلاب چھڑکا اور بادشاہ نے مجھے خلعت سے سرفراز
کیا۔ اِس نے اپنے درباریوں سے پوچھا کہ اِس شاعر کو کون سا انعام دینا زیادہ مناسب ہوگا؟
انھوں نے عرض کیا کہ جو حضور کی مرضی ہو۔ حضور کی اِس قدر عزت افزائی ہی سب سے بڑا انعام
ہے۔ میں نے عرض کیا کہ میں کسی انعام کا طالب نہیں ہوں بلکہ اپنے کلام کی سچی داد کا۔ بادشاہ
نے میرے اِس جواب کو بہت پسند کیا اور مجھکو رامائن کا ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔ جب میں دربار سے
باہر نکلا تو لوگ اضطرابِ شوق سے میری طرف بڑھے اور مجھے اپنے وقت کا والمیکی کہنے لگے۔"

یہ باتیں صاف ظاہر کر رہی ہیں کہ یہ دربار کوئی مسلم دربار تھا۔ کدار خاں کی موجودگی اور بادشاہ کا خلعت عطا فرمانا اور اِس کے بعد تمام درباریوں سے استفسار کرنا کہ کون سا انعام اِس کے حسبِ حال ہوگا کافی ثبوت اِس بات کے ہیں کہ بادشاہ کوئی مسلمان بادشاہ تھا اِس لئے کہ کوئی ہندو راجہ کسی ودیارتھی کے انعام دینے میں کبھی نہ ہچکچاتا اور نہ اپنے وزیروں سے ایسا سوال کرتا اِس لئے کہ وہ ہندو رسم و رواج سے واقف ہوتا۔

غرض مُسلمانوں کی قدردانی اور حوصلہ افزائی سے تاریخ بھری پڑی ہے اور پرانی بنگالی کتابیں ایسے اذکار سے پُر ہیں۔ ہم یہاں صرف ایک حوالہ پر اکتفا کرتے ہیں۔

"جب شفق کی سُرخی سونا مُرا کی بلند چوٹیوں کے سرسبز گھنے درختوں میں روپوش ہو جاتی تھی
پیرگل خاں اپنے درباریوں کو محل میں طلب کرتا تھا۔ اِس وقت مہا بھارت کا مترجم معزز درباریوں
کے سامنے اپنا ترجمہ سُناتا تھا اور دلچسپ اور پُرلطف قطعات کی گورنر خود داد دیتا تھا۔ شاعر
اپنے مُربّی کو کلجگ میں ہری کا اوتار کہتا تھا اور انتہائے لطف و کرم یہ تھا کہ صاحبِ تخت
باوجود مُسلمان ہونے کے جس کے لئے ایسے الفاظ سخت توہین آمیز تھے کشادہ پیشانی سے
ایسے خطابات کو قبول فرماتا تھا اور شاعر کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔"

مُسلمانوں کی اِس زبان پروری کا یہ اثر ہوا کہ ہندو راجاؤں نے بھی اب مُسلم تقلید میں بنگالی شعرا کو اپنے دربار میں جگہ دینی شروع کی۔ برہمنوں کے بنائے کچھ نہ بنی اور یہ زبان یوماً فیوماً ترقی کرنے لگی۔ مگر فارسی کے

فاتحانہ اثر سے یہ بری نہ رہ سکی اور یہ لازمی نتیجہ تھا۔ بنگالی زبان میں فارسی الفاظ تو اُسی وقت شامل ہوگئے تھے جب مسلمانوں کا حملہ شروع ہوا تھا۔ ۱۲۰۳ء تک بہت سے الفاظ بنگالی زبان کے مُردہ ہوگئے تھے اور ان کے بجائے فارسی الفاظ مستعمل ہونے لگے تھے۔ مثلاً بجائے دھرما دھیکر کے لوگ قاضی کہتے تھے بجائے نشانت کے کوتوال بجائے پترا کے وزیر اور بجائے شینا کے پیک۔ نگر کو شہر۔ ٹکا کو خزانہ۔ بھومی کو زمین بھومیا کو زمیندار۔ اتھالیکا کو عمارت وغیرہ وغیرہ لوگ بولنے لگے تھے۔ مگر بنگالی شاعری کو اس وقت تک عروج حاصل نہ ہوسکا جب تک کہ مسلمانوں کے تمدن کا کافی اثر نہ پڑ لیا۔ ان کے قبل کی شاعری صرف مذہبی شاعری تھی جس کو عام طور پر گنوار گایا کرتے تھے اور جو تخیل سے مُعرّا، مناظر فطرت اور جذبۂ انسانی سے بالکل بے بہرہ تھی۔

چودھویں صدی میں مُسلمانوں کا پورا اثر پڑ چکا تھا اور اس صدی میں یہاں کے لوگوں نے ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالی جس نے یہاں کی شاعری کو بہت زیادہ وسعت دی اور اس میں ایک نئی روح پھونکی اس جماعت نے عورت کی پرستش کو تکمیلِ رُوح کا سب سے اوّل اور اتم زینہ قرار دیا۔ اس کو پراکیا رس یا مدھورا رس کہتے ہیں۔ یہ طریقہ بدھ مذہب کے سہاجیہ طرز تعلیم سے ملتا جلتا ہے۔ یہاں کے لوگوں پر بُدھ مذہب کا جس قدر اثر تھا ظاہر ہے۔ اب فلسفۂ عشق مجازی اور مُسلم عشاق کی داستانوں نے ان جذبات کو بھڑکانے میں دامن کا کام کیا۔ بنگال میں ایسے عقیدہ کا زور پکڑنا بہت ہی تعجب انگیز معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ یہاں کے تمدن کا فوٹو ایک شاعر یوں کھینچتا ہے۔

> "آفتاب کی کرنیں ہماری پردہ نشینوں کو نہیں چھو سکتیں اور ماہتاب ان غیرتانِ ماہ کے روبرو نہیں آسکتا"

جس ملک کا یہ تمدن ہو اور جہاں کے دروازے اس سختی سے غیروں کے لئے بند ہوں وہاں اس عقیدہ کا پھیلنا اور ترقی کرنا محال معلوم ہوتا ہے۔ مگر جس طرح دیگر مقامات پر بھی سوسائٹی کے قوانین جذبہ کے بہاؤ کو نہیں روک سکے یہاں بھی اس تعشق کی نہر نے مذہبی اور اخلاقی دیواروں کو منہدم کر کے ایک سیلاب عظیم برپا کردیا۔ چانڈی داس اس دور کا قیس گذرا ہے اور اپنے گرم جذبات سے اس نے اس تحریک میں ایک

نئی رُوح پھونکی ہی۔ مشرقی بنگال میں اب تک وارفتگوں کو مجنون چانڈی کہتے ہیں۔ چانڈی داس ایک دھوبن رامی نامی پر عاشق ہوگیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ کُذات کر دیا گیا۔ اِس کے بھائی نکولا نے جو ایک ذی اثر برہمن تھا اپنے ذات والوں کی بڑی خوشامد کرکے اُن کو اس بات پر راضی کیا کہ اگر چانڈی داس اپنی اس رزالت کی حرکت سے باز آئے اور رامی کے عشق سے دست بردار ہو تو پھر ذات میں لے لیا جائے۔ اِس تقریب کے لئے نکولا نے ایک دعوت کا سامان کیا۔ اِس کی خبر رامی کو پہونچی اور برق بن کر اِس کے کلیجے کے پار ہوگئی۔ جب ذرا سنبھلی اور ہوش میں آئی تو آنسوؤں کے سوتے بہ نکلے اور آتشِ عشق نے اِس کو اِس درجہ مضطر کیا کہ گھر سے چل نکلی اور اُس مقام پر پہونچی جہاں اُن برہمنوں کا اجتماع تھا مجمع میں چانڈی داس کو دیکھکر وہ اپنے حواس میں نہ رہی اور زار وقطار رونے لگی۔ چانڈی کی جب اِس پر نظر پڑی تو اپنے سارے وعدے بھول گیا اور پروانہ وار اِس کے قدموں پر جا گرا اور معافی کی التجا کرنے لگا۔ اِس واقعہ کے بعد وہ زندگی بھر برہمن دیوتاؤں کو چھوڑ کر اِس حُسن کی دیوی کو پوجتا رہا۔ اِس نے اپنے کلام میں بار بار رامی کو ویدوں کی ماں گیاتری کہکر پکارا ہی ایک مقام پر چانڈی داس کہتا ہی۔

"او دھوبن میری ملکہ تو میرے لئے وہ سب کچھ ہی جو ایک بچے کے لئے ماں باپ ہوتے ہیں۔ وہ نماز ثالثہ جو ایک برہمن روزانہ اپنے خدا کے لئے پڑھتا ہی میں تیری پرستش میں ادا کرتا ہوں۔ تو میرے لئے اتنی ہی پاک ہی جتنی گیاتری جس سے ویدوں نے جنم لیا ہی۔ میں تجھکو سرَسوتی دیوی جانتا ہوں جو مجھ میں نغمہ پھونکتی ہے۔ میں تجھکو پربتی جانتا ہوں۔ تو میری گردن کی مالا ہی۔ تو میرا آسمان ہی اور میری زمین اور میری آنکھوں کا اُجالا ہی جس دن میں تیرے چاند سے مکھڑے کو نہیں دیکھتا ہوں اُس روز مثل مُردے کے رہتا ہوں۔ تیری دوشیزگی پر میرا عشق کوئی نفسانی خواہش نہیں رکھتا ہی۔"

چانڈی داس کی بلند خیالی و نغمہ نوازی اور جذبۂ فطرت کی حقیقی مصوری کا حسب ذیل نظم سے پتہ چلتا ہی۔

"ایسا افسانہ کسی نے کبھی نہ سُنا ہوگا۔ اُن کے دل روز ازل سے ایک دوسرے سے وابستہ ہیں (روز ازل بود کہ پیماں محبت بستند) وہ ایک دوسرے کے سامنے ہیں مگر فرقت کے اندیشہ

سے رو رہے ہیں اگر ایک دوسرے کی نظر سے ایک لمحہ کے لیے بھی ہٹ جاتے ہیں تو اُن پر موت سے زیادہ سخت گھڑیاں گذر جاتی ہیں اور ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگتے ہیں۔ تم کہتے ہو کہ آفتاب کنول کو پیار کرتا ہی لیکن کنول کہر میں مُرجھا جاتا ہے اور آفتاب خوش و خرم رہتا ہی۔ تم کہتے ہو کہ بادل اور چٹا کا ایک دوسرے کو محبوب ہیں لیکن بر اپنے وقت مُعیّنہ کے قبل ایک قطرہ پانی بھی اس چڑیا کو نہیں دیتا۔ پھول اور شہد کی مکھی طالب و مطلوب کہے جاتے ہیں لیکن شہد کی مکھی اگر پھول کے پاس نہیں آتی پھول اُس کے پاس کبھی نہیں جاتا۔ چکور کو چاند کا عاشق کہنا حماقت ہی۔ چاندی داس کے عشق کا کسی سے مقابلہ کرنا ہی عبث ہی۔"

ایک مقام پر مفارقت کا منظر کھینچتے ہوئے چاندی داس کہتا ہی:-

"وہ اپنے دامن سے اپنے محبوب کو پنکھا جھلتا ہی اور اگر وہ اپنا سر ذرا بھی پھیر لیتا ہے تو یہ جُدائی کے خوف سے لرز اُٹھتا ہی۔ جب مُلاقات ختم ہونے پر آتی ہے تو میری رُوح میرے جسم سے پرواز کر جاتی ہی۔ آہ اس کو بیان کرتے ہوئے میرا کلیجہ پھٹتا ہی!!!

کیا میں اب جاؤں؟ وہ تین بار یہ سوال کرتا ہی۔ آہ اِن لفظوں کے ساتھ کتنی ہم آغوشیاں اور کتنے گرم بوسے ہوتے ہیں وہ آدھا قدم چلتا ہے اور پھر پلٹ کر میری طرف تاکتا ہی۔ وہ میرے چہرے پر ایسی مضطربانہ نظر ڈالتا ہی کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ وہ اپنے ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیتا ہی اور مجھے اپنی قسم کھانے کے لئے کہتا ہی۔ آہ وہ دوسری ملاقات کے لئے کس طرح میری خوشامد کرتا ہی اس کا عشق اس قدر گہرا ہی اور اس کی التجائیں اس قدر صادق ہیں کہ انھیں ہمیشہ میرے دل میں رہنے دو۔"

چاندی داس ایک دوسری جگہ اپنے عشق کا ان الفاظ میں اعادہ کرتا ہی۔

"اے میرے محبوب تو میری زندگی ہی۔ میرا جسم اور میری رُوح سب تیری خدمت کے لئے ہیں میرا خاندانی اعزاز میری شہرت میرا ایمان، میرا شرف اور وہ سب کچھ جو میرا ہے تیرا ہی۔"

سچ تو یوں ہی کہ چانڈی داس اور ودیا پتی جو اِس کا ہمعصر تھا اور پندرھویں صدی کے آخر تک زندہ رہا ہی، اِن دو زبردست شاعروں کے ہوتے مُردہ سے مُردہ زبان بھی جی اُٹھتی۔ بنگالی شاعری پر اُنھیں کے زمانہ سے حقیقی معنوں میں "شاعری" کا اطلاق ہوتا ہی۔ فارسی زبان کا بھی تسلط پورے طور پر اب اِس زبان پر ہوگیا تھا اور حافظ، سعدی، مولانا روم اور فریدالدین عطار لوگوں کے زبان زد تھے کہ پندرھویں اور سولھویں صدی میں صوفیائے کرام کے مسلک نے تمام ہندوستان میں ایک نئی رُوح پھونکدی اور ایک انقلاب عظیم برپا کردیا۔ اِس دور میں چار زبردست مصلح قوم پیدا ہوئے جنھوں نے ہندوستان کے چار کونے سنبھالے چیتنیا بنگال میں، دنیاں دیو مہاراشترا میں، کبیر وسط ہند میں اور نانک پنجاب میں۔ اِن چاروں کا ایک ہی مسلک تھا صرف جزویات میں معمولی طور پر ایک دوسرے سے اختلاف تھا۔ چیتنیا کہتا ہی کہ ہر شخص سری کرشن کی پرستش ذات پات سے علیحدہ ہو کر کرسکتا ہی اور ہر شخص اپنے خدا کی محبت میں فنا ہو کر اس کا ہم ذات ہوسکتا ہی۔ ایک مقام پر یہ کہتا ہی "اگر ایک چنڈال متقی ہے اور خدا سے محبّت رکھتا ہی تو وہ سب برہمنوں سے افضل ہی۔ اگر کوئی کہے کہ اے کرشن تو میری زندگی ہی تو وہ یعنی کرشن فوراً اسے سینہ سے لگا لیگا۔ خواہ وہ کسی مذہب وملت کا ہو"۔ چیتنیا کی نظروں میں چھوت چھات کوئی چیز نہیں ہی اِس کا قول ہے کہ اگر کوئی ایک ڈوم کے برتن میں کھائے تو وہ اپنی اس خاکساری کے صلہ میں رحمتِ الٰہی کا مستحق ہوگا۔ اگر ایک موچی سچے دل سے خدا کی یاد کرتا ہے تو میں اس کے سو بار قدم چومنے کے لئے طیار رہوں۔ بھٹاچاریوں نے اس کی مذمّت وتذلیل میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا اور آخر کار لاچار ہو کر قاضی سے فریاد کی کہ اِس کا جلوس سنکرتنا جس میں یہ لوگ ہری کا بھجن گاتے ہوئے چلتے تھے شہر میں نکلنے سے بند کردیا جائے۔ قاضی نے فتنہ وفساد کے خوف سے ایسا ہی کیا لیکن چیتنیا نے اُسی روز شام کو نہایت شان وشوکت کے ساتھ جلوس نکالا اور ٹھیک قاضی کے دروازہ پر لے گیا۔ قاضی پہلے تو اپنے حکم کی نافرمانی پر بہت برافروختہ ہوا مگر جب اُس نے چیتنیا کی شراب محبت سے مخمور آنکھیں جو مثل آفتاب کے روشن تھیں دیکھیں تو اس کی سچائی کا قایل ہوگیا، اپنا حکم واپس لے لیا اور بڑے شوق سے جلوس دیکھتا رہا۔ چیتنیا کو فنا فی الکرشن کہئے تو بجا ہے۔ یہ شخص اب بھی بنگال اور اوڑیسہ میں اوتار مان کر پوجا جاتا ہی یہ ۱۴۸۶ء میں پیدا ہوا اور ۱۵۳۴ء میں مرگیا۔ سولھویں صدی میں یہ زبان اپنے پورے شباب پر تھی اور جیسا کہ ہم اوپر بیان

کر آئے ہیں، مدھو رارس کی حُسن پرستی اور چیتنیا کے دَورِ تصوّف نے اِس کو بہت بلند کر دیا تھا اور اب یہ تمام انسانی جذبات کی اہم درجہ پر ترجمانی کرنے پر قادر تھی۔ لیکن سترھویں صدی میں آکر شاہجہاں کے آخری دَور کے ساتھ جب مُسلمانوں کے زوال کی بُنیاد پڑی اِس کو بھی انحطاط ہوا۔ یہاں کی شاعری میں وہ فطری جذبات وہ بلند خیالات اور پاکیزہ تخیلات اب باقی نہ رہے تھے۔ شعرا نے خدائی چوکھٹ چھوڑ کر اب راجاؤں کے در کی جبہہ سائی شروع کر دی تھی اور ان کی خوشنودی کے لئے اُن کی طبعی پرواز معشوقوں کی زلفوں میں پھنس کر رہ گئی تھی اور موئے کمر میں بندھ کر خود بھی معدوم ہو گئی تھی جس کی ایک مثال حسب ذیل ہے:

"اے راجہ میں اِس کی زلف کی کس طرح تعریف کروں لوگ اِس کو نافۂ ختن سے تشبیہ دیتے ہیں لیکن دمائینتی کی زلف کو اِس چیز سے مشابہ کرنا جس کو جانور شرم سے اپنے شکم میں چھُپائے رہتا ہی محض حماقت ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اِس کی آنکھ مثل غزال (نظم میں خود غزال کا لفظ موجود ہی) کے ہی لیکن غزال اِس رشک میں اپنے پیر زمین پر پٹکتا ہی۔ خداوند تعالیٰ نے چاند کے جوہر سے دمائینتی کا چہرہ بنایا ہی اسی لئے چاند میں سُوراخ ہو گیا ہی جسے لوگ غار کہتے ہیں۔ کنول دمائینتی کے حسُن سے شرما کر آبی قلعوں میں رُوپوش ہوئے ہیں۔ خداوند تعالےٰ نے دمائینتی کی تخلیق سے پہلے اور عورتوں کو پیدا کر کے نسوانی حسن کے صناعی میں مہارت حاصل کی تاکہ وہ دمائینتی کے جسم کو مکمل بنا سکے۔"

ایک تو مذاق اِس قدر گر گیا تھا دوسرے ملک میں قتل وغارت کا بازار گرم تھا اور بغاوت اور سازش کے ہر جگہ مدرسے کھُل گئے تھے۔ قاعدہ ہی کہ دَورِ انقلاب میں قلم کا دور ختم ہو جاتا ہی اور اِس کا میدان بالکل مسدود۔ اِس صورت میں ضرورت تھی کہ کوئی اس زبان کا ناخدا پیدا ہو جو اِس کو اِس طوفان سے بچائے اور مستقبل کے مہیب دَور کے لئے اِس کی مستحکم بنیاد قایم کر جائے۔ جن جن زبانوں کی حیات خدا کو منظور ہوئی ہی اِن کے لئے ایسے پرخطر دَور میں ہمیشہ ایک مردِ غیب کا ظہور ہوا ہی جس نے کار نمایاں کئے ہیں چنانچہ بنگالی زبان کو بھی سنبھالنے اور عروج دینے کے لئے ایک شخص اِس دَور میں پیدا ہوا۔ یہ کوئی برہمن یا گوتمی (بدھ مذہب رکھنے والا) نہ تھا بلکہ ایک مسلمان تھا جس نے زبان کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو بچا لیا اور موخرین کا کیا ذکر ہے

اپنے متقدمین پر بھی سبقت حاصل کی۔ اگر اس کو بنگالی زبان کا پیغمبر سخن کہا جائے تو بجا ہے اور اگر مسلمان اس کی نسبت سے اپنے کو بنگالی زبان کا جان بخش کہیں تو ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا۔

علاؤل نواب جلال پور کے ایک وزیر کا لڑکا تھا جب یہ کمسن تھا اس نے اپنے باپ کے ساتھ ایک ایک بحری سفر کیا۔ اس کے بیڑے پر پرتگالی بحری قزاقوں کا حملہ ہوا اور اس کا باپ ان سے دست بدست جنگ میں مارا گیا علاؤل کی قسمت میں ابھی اور بھی مصائب جھیلنے تھے جو ہر ادیب کا خاص حصہ ہوا کرتا ہے۔ وہ کسی طرح بھاگکر اراکان پہونچا۔ یہاں کے صاحب حکومت مسلم وزیر مگن ٹھاکر کی فرمایش سے اس نے پدماوت کا ترجمہ بنگالی میں کیا۔ مگن ٹھاکر ہی کے کہنے سے اس نے سیف الملوک او ربدیع الجمال کا بنگالی میں ترجمہ شروع کیا لیکن اپنے مربی کی اچانک موت سے برداشتہ خاطر ہوکر اس نے اس ترجمہ کو ادھورا چھوڑکر گوشۂ عافیت کی زندگی اختیار کی۔ مگر ابھی دنیا کے مصائب اس پر ختم نہ ہوئے تھے اور ابھی اس کو چند اور مصیبتوں کا سامنا کرنا تھا اسی زمانہ میں شجاع (اورنگ زیب کا بھائی) اراکان بھاگ کر آیا اور اس آفت کے مارے سے اور سردار اراکان سے سخت جنگ ہوئی جس کا انجام شجاع کی فاش شکست تھا۔ ایک درانداز مرزا نامی نے جو علاؤل سے للّٰہی بغض رکھتا تھا سردار اراکان سے یہ لگادی کہ شجاع کی آمد میں علاؤل کی سازش شریک تھی۔ علاؤل قید خانہ میں ڈال دیا گیا اور کئی سال بعد وہاں کے مظالم سے اس کو نجات ملی۔ سید موسیٰ نے جو اراکان کا ذی اقتدار شخص تھا علاؤل کی ان برے دنوں میں خبر لی اور اسی کی فرمایش سے علاؤل نے سیف الملوک اور بدیع الجمال کا باقی ماندہ ترجمہ پورا کیا۔ دربار کے ایک ذی اثر شخص سید محمد خاں کے اصرار سے اس نے فارسی نظم ہفت پیکر کا بنگالی میں ترجمہ کیا اس کے علاوہ اس کی بہت سی نظمیں رادھا اور کرشن کی تعریف میں ہیں۔ علاؤل ۱۶۱۸ء میں پیدا ہوا ۱۶۶۰ء میں قید کیا گیا اور اپنے رہائی کے بعد سترھویں صدی کے آخر تک زندہ رہا۔

علاؤل نے بنگالی زبان میں کثرت سے سنسکرت کے الفاظ شامل کرکے اس کو بہت بلند کر دیا اور بنگالی زبان کے نئے محاورات کا بانی ہوا ہے اس کی بلند خیالی اور نکتہ سنجی کا حسب ذیل نظم سے پتہ چلتا ہے:۔

"پدماوتی کے چہرے سے جو شعاع نکلتی ہے وہ اس کرن کو جو ایک طلائی آئینہ سے نکلتی ہے شرمادیتی ہے اس کے چہرے کے متعلق ایک امر نہایت تعجب خیز ہے وہ یہ کہ دو کنول ماہتاب کے طباق میں

مقید ہیں۔ آفتاب جو اپنے دوستوں کو دشمن کے ہاتھوں اس طرح محبوس دیکھتا ہے تو ان کی رہائی کے لئے پیشانی کے شہابی رنگ میں اُبھر آتا ہے۔ عشق کا دیوتا آفتاب کی مدد میں بھووں کی کمان کھینچتا ہے اور اس کی آنکھوں کا نشانہ تاکتا ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ یہ دوست اتنے قریب رہکر ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکے"۔

یہ استعارہ تلمیح طلب ہے کنول اس کی آنکھیں ہیں۔ آفتاب سنسکرت روایت کے مطابق کنول کا عاشق ہوتا ہے اور ماہتاب اس کا دشمن کنول دن میں کھِلتا ہے اور شام کو مُرجھا جاتا ہے۔ بدیع الجمال کے شروع میں علاول کہتا ہے:۔

"روشنی کی عزت کہاں رہ جاتی اگر یہ تاریکی کے پہلو بہ پہلو نہ رکھی جاتی۔ اگر دنیا میں بدکار نہ ہوتے تو تقدس کی زندگی کی کون قیمت جانتا۔ سمندر کے نمکین پانی سے ہم کو شیریں پانی کا زیادہ مزا ملتا ہے۔ اگر کنجوس نہ ہوتے تو ہم فیاض لوگوں کی تعریف نہ کر سکتے۔ سچ اور جھوٹ محض ایک تصویر کے دو رخ ہیں۔ اے علاول تو دنیا کی تعریف اور مذمت کو مت سُن۔ جو تھوڑا ذخیرہ تو اپنے دل میں رکھتا ہے اسے بغیر کسی شرم و حجاب کے تو آزادی سے دنیا والوں کو تقسیم کر دے"۔

علاول نے ہندو رسم و رواج اور مذہبی ارکان کی ادائیگی کا اتنا اچھا مرقع کھینچا ہے کہ تعجب ہوتا ہے کہ ایک مسلمان کیوں کر اس کام کو انجام دے سکا جس کو مذہبی شعرا تکمیل دینے سے قاصر رہے۔

اس نے عاشق و معشوق کی جدائی کے دس مختلف پہلو اور صورتیں دکھلائی ہیں۔

اس نے ادویات پر اتنی زبردست بحث کی ہے اور فنِ حکمت پر اتنی مبصرانہ کتاب لکھی ہے کہ اس کو پڑھ کر ایک شخص پورا حکیم بن سکتا ہے۔

اس نے سیاروں کی گردش اور انسانی قسمت پر ان کے اثر کو اتنے مدلل اور مکمل پیرائے میں دکھلایا ہے کہ ایک نجومی اس سے سبق حاصل کر سکتا ہے۔

اس نے شاعری کے نئے اصول ایجاد کئے اور نئے اوزان مقرر کئے ہیں۔

غرض علاؤل نے اس زبان کو اتنی ترقی دی اور اسس قدر مستحکم کر دیا کہ یہ سخت سے سخت حوادث کا مقابلہ کر کے اب ہندوستان کی ایک مستند زبان ہو گئی -

اِس زبان نے پراکرت سے جنم لیا - فارسی تربیت پائی اور سنسکرت کا جامہ پہنا - اِس وجہ سے اس میں پراکرت کی پاکیزگی فارسی کی نازک خیالی اور شیرینی اور سنسکرت کی جامعیت سب موجود ہے چوں کہ اس میں تین زبانوں نے اکٹھا ہو کر ایک نیا جنم لیا ہے یہی وجہ ہے کہ آج یہ ہر جذبہ کی ترجمانی پر اِس قدر قادر ہے اور تخیل کی ہر پرواز اِس میں اپنا نشیمن پاتی ہے لیکن سب سے زیادہ حصّہ اِس میں فارسی کا ہے اور اِس کے ثبوت کی زیادہ ضرورت نہیں اِس لئے کہ مسلمانوں کے زمانے کی کل تصانیف "مسلم بنگالہ" کہلاتی ہیں -

آثار الکرام

۔ تاریخ ۔

ترقی علوم و فنون

بعہد

سلطنت مسلمانان ہندوستان

نوشتہ

حکیم سید شمس اللہ قادری ۔ ایم ۔ آر ۔ اے ۔ ایس

کارسپانڈنگ ممبر آف دی نیومسماٹک سوسائٹی آف انڈیا و ممبر

آف دی ہسٹاریکل سوسائٹی آف پنجاب وغیرہ وغیرہ

باب اول

مقدمہ

فتوحاتِ اسلام ۔ وسط ایشیا میں خودمختار سلطنتوں کی ابتدا ۔ آل طاہر ۔ آل صفار ۔ آل سامان ۔ آل زیار ۔ الپتگین ۔ آل سبکتگین ۔ سلاطین آل سبکتگین ۔ آل سبکتگین کے عہد میں وسطِ ایشیا کی علمی حالت ۔ آل سبکتگین کا مذاقِ علمی ۔ سلطنت آلِ سبکتگین کے علمی مرکز ۔ فارسی شاعری

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات (۱۱ھ ـ ۶۳۲ء) تک اسلامی حکومت عربستان کے کل جزیرہ نما

میں پھیل گئی تھی۔ حضرت ابوبکر صدیق (۱۱ھ/۶۳۲ء تا ۱۳ھ/۶۳۴ء) کے عہد خلافت میں پیروانِ اسلام نے عرب سے باہر قدم رکھا۔ چالیس سال کے اندر اندر ایران و خراسان کو فتح کر کے دریائے نیلاب تک پہونچ گئے۔ مغرب میں مسلمانوں نے پہلے پہل مصر میں قدم رکھا۔ پھر بحر ابیض کے کنارے کنارے بربر و کارتیج کو فتح کرتے ہوئے ۹۱ھ/۷۰۹ء تک ہسپانیہ میں پہونچ گئے۔ قرن اول کے ختم ہونے سے پہلے بحر اوقیانوس سے دیوار چین تک دنیا کا دو ثلث رقبہ مسلمانوں کے حیطۂ اقتدار میں آگیا۔

خلفائے عباسیہ (۱۳۶ھ/۷۵۴ء تا ۶۵۶ھ/۱۲۵۸ء) کے اوائل عہد میں اس عظیم الشان سلطنت کو انحطاط شروع ہوا دور و دراز کے علاقے خلفاء کے اثر و اقتدار سے آزاد ہونے لگے۔ مغرب سے اس کی ابتدا ہوئی۔ عبدالرحمن اموی (۱۳۸ھ/۷۵۶ء تا ۱۷۲ھ/۷۸۸ء) نے ۱۳۸ھ/۷۵۶ء میں ہسپانیہ میں علم استقلال بلند کیا۔ اس کے بعد مصر اور شمالی افریقہ میں بنی اغلب (۱۸۴ھ/۸۰۰ء ۲۹۶ھ/۹۰۹ء) اور بنی طولون (۲۵۴ھ/۸۶۸ء تا ۲۹۲ھ/۹۰۵ء) کے خود مختار خاندان قائم ہوئے۔ خلیفہ مامون (۱۹۸ھ/۸۱۳ء تا ۲۱۸ھ/۸۳۴ء) کے زمانہ سے مشرق میں خود مختار حکومتوں کا آغاز ہوا۔ مامون نے اپنے صاحب الجیش طاہر ذوالیمین کو خراسان کا والی مقرر کیا تو اس نے اپنی قوت و اقتدار کو بڑھا کر طوقِ اطاعت سے آزاد ہونے کی کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خلفائے بغداد نے خراسان کی حکومت کو اس کے خاندان میں موروثی تسلیم کر لیا۔ اسی زمانہ میں خلفا کی کمزوری سے دیگر والیانِ ملک نے بھی فائدہ اٹھایا۔ بحر اخضر کے نیچے دیلم و گیلان میں سادات علوی آزاد ہو گئے۔ سجستان و نیمروز میں یعقوب بن لیث بن صفار کا ظہور ہوا۔ اور تھوڑی ہی مدت میں اس نے آل طاہر کو خراسان سے بیدخل کر کے ہرات سے شیراز تک تمام ایران پر قبضہ کر لیا اور ایسی قوت پیدا کی کہ خلفائے بغداد بھی اس سے ہراساں ہونے لگے۔

تیسری صدی کے اخیر ایام میں آل سامان نے میدان ترقی میں قدم رکھا۔ اس خاندان کے مورث اعلیٰ اسد بن سامان کے چار لڑکے مامون کے زمانہ میں ماوراء النہر کے مختلف علاقوں پر گورنر مقرر ہو گئے تھے۔ ان میں نوح بن اسد جو سمرقند کا والی تھا بہت ہوشیار اور اولوالعزم آدمی تھا۔ اس نے نہ صرف اپنے علاقہ کا انتظام کیا بلکہ دوسرے بھائی احمد بن اسد سے فرغانہ کو لے کر ترکستان میں کاشغر تک اپنی حکومت کو وسیع کر دیا۔ نوح کے ان ابتدائی فتوحات سے ماوراء النہر میں ایک چھوٹی سی حکومت قائم ہو گئی جسے اس کے جانشین

اسمٰعیل بن احمد (۲۷۹ھ/۸۹۲ء تا ۲۹۵ھ/۹۰۷ء) نے اپنے زمانہ میں خوب ترقی دی۔ خلیفہ بغداد کی تحریک سے اس نے ۲۸۷ھ/۹۰۰ء میں صفاریوں (۲۵۴ھ/۸۶۷ء تا ۲۹۰ھ/۹۰۳ء) پر لشکر کشی کی۔ عمر بن لیث کے گرفتار ہو جانے سے خراسان پر اس کا قبضہ ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے طبرستان کے حاکم محمد بن زید علوی کو شکست دے کر اپنا مطیع بنا لیا۔ اسمٰعیل کے یہ فتوحات بڑھتے ہوئے دجلہ تک پہونچ گئے اور ایران و خراسان کا تمام ملک اس کے تصرف میں آ گیا۔ لیکن اس وسیع مملکت پر سامانیوں کا قبضہ تھوڑے ہی زمانہ تک قائم رہا۔ آل بویہ (۳۲۰ھ/۹۳۲ء - ۴۴۷ھ/۱۰۵۵ء) کے ظہور سے عراق اور جنوبی ایران میں ان کی حکومت ختم ہو گئی۔ قریب قریب اسی زمانہ میں الپتگین نے جیحوں کے نیچے سلطنت غزنویہ کا سنگ بنیاد رکھا۔ ترکستان میں ترکان افراسیابیہ نے عروج پکڑنا شروع کیا۔ ان جدید حکومتوں کی بڑھتی ہوئی قوت نے سامانیوں کی طاقت مسدود کر دی۔ اخیر کے دونوں خاندان اگرچہ سامانیوں کے مطیع اور زیر فرمان تھے، لیکن ان کے ضعف و انحطاط سے برابر فائدہ حاصل کرتے رہے یہاں تک کہ ایلک خاں (۳۸۳ھ/۹۹۳ء - ۴۰۳ھ/۱۰۱۲ء) نے ۳۸۹ھ/۹۹۹ء میں بخارا پر قبضہ کر لیا۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد سلطنت سامانیہ کا خاتمہ ہو گیا۔

آل سامان کے دربار میں کثرت سے ترکی غلام تھے اور ان بادشاہوں نے انھیں سلطنت کے بڑے بڑے عہدوں پر مامور کیا تھا۔ ان غلاموں میں ایک کا نام الپتگین تھا۔ عبدالملک بن نوح (۳۴۳ھ/۹۵۴ء - ۳۵۰ھ/۹۶۱ء) نے اسے ۳۴۶ھ/۹۵۷ء میں ہرات کا گورنر مقرر کیا۔ لیکن کسی وجہ سے ۳۵۰ھ/۹۶۱ء میں معزول کر کے یہ خدمت ابوالحسن بن علی سیمجور کو تفویض کر دی۔ الپتگین اپنی معزولی سے ناراض ہو کر افغانستان میں چلا آیا اور غزنین کو صدر مقام قرار دے کر چھوٹی سی حکومت قائم کر لی۔ ۳۵۲ھ/۹۶۳ء یا ۳۵۳ھ/۹۶۴ء میں الپتگین کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا لڑکا ابو اسحٰق اور اس کے بعد دو ترکی غلام بلکاتگین اور پیری یکے بعد دیگرے چودہ سال تک غزنین میں حکومت کرتے رہے۔ ۲۷ شعبان ۳۶۶ھ/۹۷۶ء کو نوح بن منصور (۳۶۶ھ/۹۷۶ء - ۳۸۷ھ/۹۹۷ء) کے ایما سے پیری نے حکومت غزنین سبکتگین کے حوالے کر دی۔ اس تاریخ سے سلطنت آل سبکتگین کی بنیاد پڑی ہے۔

امیر ناصر الدین سبکتگین جب برسرِ حکومت ہوا تو اس کے قبضہ میں بہت تھوڑا ملک آیا۔ لیکن

اس نے اپنی قوت کو بڑھا کر مقبوضات میں وسعت دینا شروع کیا۔ پنجاب کے ہندوؤں کو شکست دے کر پشاور پر قبضہ کرلیا۔ شمال میں بڑھتا ہوا خراسان تک چلا گیا۔ ۳۸۳ھ/۹۹۴ء میں ابوعلی سیمجور نے ماوراء النہر میں بغاوت کی اور امیر نوح بن منصور سے اس کی مدافعت نہ ہوسکی تو نوح بن منصور نے سبکتگین سے مدد چاہی۔ سبکتگین کی حسن لیاقت سے جب بغاوت فرو ہوگئی تو نوح بن منصور نے خوش ہوکر افغانستان کی حکومت کے ساتھ خراسان کی حکومت بھی اس کو تفویض کردی اور اس کے لڑکے امیر محمود کو سیف الدولہ کا خطاب دے کر یہاں کا سپہ سالار مقرر کیا۔ سبکتگین اس مہم سے واپس آرہا تھا کہ راستہ میں بمقام ترمذ ۳۸۷ھ/۹۹۷ء میں اس کا انتقال ہوگیا۔

سبکتگین کے بعد اس کا لڑکا اسمٰعیل برسر حکومت ہوا لیکن محمود نے اُسے معزول کرکے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس وقت سلطنت سامانیہ تباہی کے قریب ہوگئی تھی۔ نوح بن منصور (۳۶۶ھ/۹۷۶ء – ۳۸۷ھ/۹۹۷ء) کے مرنے سے ماتحت حکام کو خوب اقتدار حاصل ہوگیا تھا۔ جنوب میں محمود کی اور شمال میں ایلک خاں کی قوت روز بروز بڑھ رہی تھی۔ عبدالملک بن نوح (۳۸۹ھ/۹۹۹ء) ایلک خاں کے مقابلہ میں کئی بار ہزیمت اُٹھا کر ۱۰ ذوالقعدہ ۳۸۹ھ/۹۹۹ء کو گرفتار ہوگیا تو اس پر وسط ایشیا کی اس عظیم الشان سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔ مملکت سامانیہ کو محمود اور ایلک خاں نے باہم تقسیم کرلیا۔ دریائے جیحوں دونوں کا حد فاصل قرار پایا۔ شمالی ملک جس سے ماوراء النہر مراد ہے ایلک خاں نے لے لیا اور جنوبی علاقہ جس میں خراسان و افغانستان شامل ہیں سلطان محمود کی سلطنت میں داخل ہوگیا۔

سلطان محمود نے ۳۹۳ھ/۱۰۰۲ء سے ۴۱۸ھ/۱۰۲۷ء تک تقریباً بائیس سال کے عرصہ میں ہندوستان پر بارہ حملے کئے جن کے حالات مورخ محمد قاسم فرشتہ نے تفصیل وار تحریر کئے ہیں۔ ان حملوں کی وجہ سے اس کی حکومت جنوب میں بتدریج وسیع ہوتی گئی۔ کشمیر و پنجاب کی فتح کے بعد ۴۰۹ھ/۱۰۱۸ء میں قنوج و متھرا اس کے قبضہ میں آئے۔ ۴۱۳ھ/۱۰۲۲ء میں کالنجر کے راجہ کو مطیع بنایا۔ ۴۱۸ھ/۱۰۲۷ء میں گجرات پر لشکر کشی کرکے سومنات کو تاخت و تاراج کیا۔ ہندوستان کے علاوہ محمود نے شمال میں جو فتوحات حاصل کئے ہیں اُن کی تفصیل کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ اس نے ایلک خاں کو شکست دی بعد ازاں غور کو ۴۰۷ھ/۱۰۱۶ء میں خوارزم کو ۴۱۷ھ/۱۰۲۶ء میں مرغاب

کو فتح کیا۔ اسی سال ماوراء النہر کا ایک وسیع علاقہ جس میں سمرقند و بخارا واقع ہیں سلطنت غزنویہ میں شامل ہوگیا
۴۱۸ھ/۱۰۲۷ء میں آل سلجوق نے اطاعت قبول کی۔ ۴۲۰ھ/۱۰۲۹ء میں آل بویہ نے ہزیمت اٹھا کر اصفہان کا تخلیہ کر دیا
محمود نے ۳۱ سال حکومت کی اس مدت میں اس کی سلطنت سیحون سے خلیج فارس اور بحر اخضر سے
دریائے خنجب تک پھیل گئی تھی۔ لیکن اس کو جس قدر جلد ترقی ہوئی تھی اُسی قدر جلد تنزل و انحطاط ہوگیا۔ محمود کے
بعد سلجوقیوں نے خوب زور پکڑا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں ایران و ماوراء النہر کے کئی صوبے بلخ، خوارزم، اصفہان
رے وغیرہ مسعود سے چھین لئے۔ علاء الدین غوری نے بہرام شاہ کے زمانہ میں جب غزنین کو فتح کر لیا تو سلاطین
غزنویہ نے لاہور میں اپنا دارالسلطنت منتقل کر دیا اور اُن کی حکومت صرف شمالی ہندوستان میں باقی رہ گئی۔
لیکن شاہانِ غور کی دست برد سے پنجاب بھی باقی نہیں رہا۔ ۵۷۱ھ/۱۱۷۵ء میں یہ لوگ دریائے چناب تک چلے آئے
اس کے بعد ۵۸۲ھ/۱۱۸۶ء میں لاہور پر یورش کر کے خسرو ملک کو گرفتار کر لیا اور اس پر سلطنت آل سبکتگین کا
خاتمہ ہوگیا۔

سلاطین آل سبکتگین

۳۶۶ھ ۹۷۶ء ـــ ۵۸۲ھ ۱۱۸۶ء

۱	امیر ناصر الدین سبکتگین	۳۶۶ھ	۹۷۶ء
۲	امیر اسمٰعیل بن سبکتگین	۳۸۷ھ	۹۹۷ء
۳	یمین الدولہ محمود بن سبکتگین	۳۸۸ھ	۹۹۸ء
۴	عماد الدولہ محمد بن محمود	۴۲۱ھ	۱۰۳۰ء
۵	نصیر الدولہ مسعود بن محمود	۴۲۱ھ	۱۰۳۰ء
	محمد بن محمود (مکرر)	۴۳۲ھ	۱۰۴۰ء
۶	شہاب الدولہ مودود بن مسعود	۴۳۲ھ	۱۰۴۰ء
۷	مسعود بن مودود (شیر خوار)	۴۴۰ھ	۱۰۴۸ء

۸	بہاء الدولہ علی بن مسعود	سنہ ۴۴۰ھ	سنہ ۱۰۴۸ء
۹	عزالدولہ عبدالرشید بن مسعود	سنہ ۴۴۰ھ	سنہ ۱۰۴۸ء
	طغرل غاصب	سنہ ۴۴۴ھ	سنہ ۱۰۵۲ء
۱۰	جمال الدولہ فرخ زاد بن مسعود	سنہ ۴۴۴ھ	سنہ ۱۰۵۲ء
۱۱	رضی الدولہ ابراہیم بن مسعود	سنہ ۴۵۱ھ	سنہ ۱۰۵۹ء
۱۲	علاء الدولہ مسعود ثانی بن ابراہیم	سنہ ۴۹۲ھ	سنہ ۱۰۹۸ء
۱۳	عضدالدولہ شیرزاد بن مسعود	سنہ ۵۰۸ھ	سنہ ۱۱۱۴ء
۱۴	سلطان الدولہ ارسلان بن مسعود	سنہ ۵۰۹ھ	سنہ ۱۱۱۵ء
۱۵	معزالدولہ بہرام بن مسعود	سنہ ۵۱۲ھ	سنہ ۱۱۱۸ء
۱۶	سراج الدولہ خسرو بن بہرام	سنہ ۵۴۷ھ	سنہ ۱۱۵۲ء
۱۷	تاج الدولہ خسرو ملک بن خسرو سنہ ۵۵۵	سنہ ۵۸۲ھ	سنہ ۱۱۸۶ء

شجرۂ نسب

(۱) سبکتگین

(۶) مودود (۷) مسعود ثانی (۸) علی (۹) عبدالرشید (۱۰) فرخ زاد (۱۱) ابراہیم مجدود گورنر ہندوستان
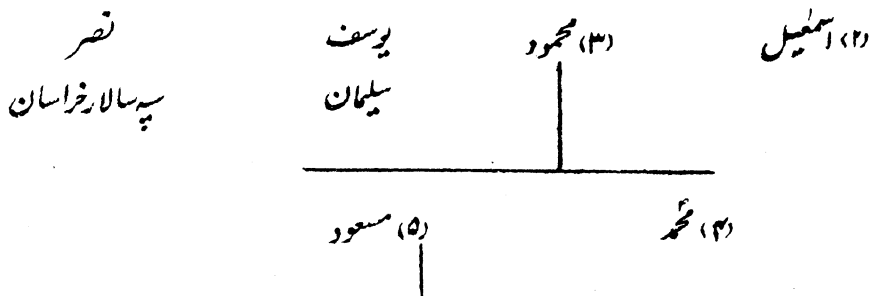
(۱۲) مسعود ثالث سیف الدولہ محمود گورنر ہندوستان

(۱۳) شیرزاد (۱۴) ارسلان (۱۵) بہرام (۱۶) خسرو (۱۷) خسرو ملک

جس زمانہ میں آل سبکتگین کا ظہور ہوا ہے، وسط ایشیا میں آفتاب علم و فن اوج کمال پر پہونچا ہوا تھا۔ قریب قریب اسی زمانہ میں امام بخاری، امام مسلم، ابونصر فارابی، بو علی سینا، امام رازی، ابوالفضل جوہری وغیرہ اسی سرزمین کی مردم خیز بستیوں میں پیدا ہوئے تھے۔ وسط ایشیا میں اس وقت جو حکومتیں قائم تھیں ان سب کے حکمران عموماً صاحبِ علم و فن اور علوم و فنون کے مربی و سرپرست تھے۔ ان حکومتوں میں ماوراء النہر کے سامانی حکمران سب سے زیادہ طاقت ور اور ذی اثر تھے۔ علمی سرپرستی کے لحاظ سے بھی ان کا پایہ بڑھا ہوا تھا۔ اس خاندان کا تیسرا فرمانروا نصر بن احمد (۳۰۱ھ ۹۱۳ء تا ۳۲۱ھ ۹۴۲ء) بڑا فیاض اور ہنر پرور بادشاہ ہوا ہے۔ استاد ابوالحسن رودکی جس کو فارسی شاعری کا ابوالآبا کہتے ہیں اس کے دربار میں ملک الشعرا کے عہدے پر مامور تھا۔ بادشاہ کی فرمائش سے اس نے کلیلہ دمنہ کے حکایات فارسی میں نظم کئے تھے[۱] اور اس کے صلہ میں چالیس ہزار درہم کا عطیہ ملا تھا۔ عنصری اپنے ایک قصیدہ میں لکھتا ہے ؎

---

[۱] شاہنامہ جلد چہارم صفحہ ۳۵ - دولت شاہ سمرقندی صفحہ ۱۰

چہل ہزار درم رودکی زمہتر خویش عطا گرفت بہ نظم کلیلۂ در کشور

نوح بن نصر (۳۳۱ھ ۹۴۳ء – ۳۴۳ھ ۹۵۴ء) نے دارالسلطنت بخارا میں ایک عظیم الشان کتب خانہ قائم کیا تھا جس میں نادر و نایاب کتابیں جمع تھیں بوعلی سینا نے اس کتاب خانہ کو دیکھا تھا اُس کا بیان ہے کہ :

"اس میں قدما کی اکثر تصنیفات ایسی موجود ہیں کہ جن کے نام بھی کسی کو معلوم نہیں تھے اور خود میں نے بھی اُنھیں آج تک نہیں دیکھا تھا"[1]

نوح بن نصر کو علوم فلسفہ سے خاص دلچسپی تھی - خلفاے بغداد کے زمانہ میں فلسفۂ یونان کی جو کتابیں عربی میں ترجمہ ہوئی تھیں اُن میں کثرت سے غلطیاں موجود تھیں - بادشاہ کی فرمائش سے ابو نصر فارابی نے ان تمام ترجموں کو صحیح و درست کیا اور ان کی مدد سے ایک ضخیم کتاب لکھی جس میں فلسفہ یونان کے تمام مسائل جمع کئے اور اُس کا نام تعلیم ثانی رکھا - اسی کتاب کی بدولت اُس کا لقب معلم ثانی مشہور ہوا ہے[2]

نوح بن نصر کے دو جانشین منصور بن نوح (۳۵۰ھ ۹۶۱ء – ۳۶۶ھ ۹۷۶ء) اور نوح بن منصور (۳۶۶ھ ۹۷۶ء – ۳۸۷ھ ۹۹۷ء) بھی علمی دنیا میں خاص شہرت رکھتے ہیں - منصور بن نوح نے عربی سے فارسی میں کئی کتابیں ترجمہ کرائی ہیں - ایران کے جو مسلمان عربی سے نابلد تھے اُن کے لئے قرآن مجید کے سمجھنے کا کوئی ذریعہ موجود نہیں تھا - اس ضرورت کو محسوس کر کے منصور نے سمرقند، اسبیجاب، فرغانہ سے علماے وقت کو طلب کیا اور اُن سے امام ابو جعفر محمد بن جریر الطبری کی تفسیر کبیر کا ترجمہ کرایا[3] - اسی زمانہ میں اس کے وزیر ابو علی محمد بن محمد بلعمی نے امام طبری کی دوسری تصنیف تاریخ کبیر کا ترجمہ کیا[4] - اسی منصور بن نوح کے زمانہ میں امیر ابو المنصور بن عبدالرزاق طوس کا گورنر تھا - اس کو تاریخ عجم سے خاص دلچسپی تھی - ہرات، سیستان، شاپور، اور طوس

---

[1] ابن خلکان - ترجمہ بوعلی سینا [2] طاشکبری زادہ نے مفتاح السعادہ (جلد ۱ صفحہ ۲۴۲) میں اور اُس کی پیروی میں حاجی خلیفہ نے کشف الظنون (باب الحکمہ) میں اس واقعہ کو منصور بن نوح کے عہد سے منسوب کیا ہے لیکن یہ صریح غلطی ہے - اس لئے کہ فارابی نے ۳۳۹ھ ۹۵۰ء میں انتقال کیا (مفتاح السعادۃ جلد ۱ صفحہ ۳۶۰) اور منصور اس کی وفات کے گیارہ سال بعد ماہ شوال ۳۵۰ھ ۹۶۱ء میں برسر حکومت ہوا ہے (عتبی ترجمہ اردو صفحہ ۸۶) [3] اس کا ایک نہایت نفیس قلمی نسخہ فرانس کے کتب خانہ ملی میں موجود ہے (دیباچہ مرزبان نامہ صفحہ ۹) [4] یہ ترجمہ نول کشور پریس لکھنؤ میں ۱۲۹۱ھ میں طبع ہوا ہے اور اس کا فرانسیسی ترجمہ چار جلدوں میں ۱۸۶۷ء میں بمقام پیرس چھپا ہے

کے چار موبدان مجوس کو جمع کر کے اُن سے خدائی نامہ کا پہلوی سے فارسی میں ترجمہ کرایا اور اُس کا نام شاہنامہ رکھا[1]۔

مشہور شاعر منصور بن احمد دقیقی نوح بن منصور کا درباری شاعر[2] تھا اور بادشاہ کی فرمایش سے اس نے تاریخ عجم کو نظم میں لکھنا شروع کیا تھا۔ لیکن اُس کی بے وقت وفات سے یہ کام ادھورا رہ گیا جس کو فردوسی نے اختتام کو پہونچایا۔

آل وشمگیر کو بھی علمی دنیا میں غیر معمولی شہرت حاصل ہے۔ یہ خاندان طبرستان میں حکمراں تھا۔ شمس المعالی امیر قابوس بن وشمگیر (۳۶۶ھ تا ۴۰۳ھ / ۹۷۶ تا ۱۰۱۲) جو سلطان محمود کا معاصر ہے بلند پایہ عالم گزرا ہے۔ عربی فارسی میں شعر خوب کہا کرتا تھا۔ خطاطی میں بھی اسے کمال حاصل تھا۔ وزیر صاحب عباد نے جب اس کے نوشتہ کو دیکھا تو ان الفاظ میں اُس کی تعریف کی "ھذا خط القابوس ام جناح الطاوس"[3]۔ امام ابو سہیل صعلوکی نے جو خراسان کے قاضی القضات تھے اس کی مدح میں متعدد تصنیفات لکھی ہیں[4]۔ ابو ریحان البیرونی سلطان محمود کے دربار میں آنے سے پہلے عرصہ تک امیر قابوس کے دربار میں رہا ہے اور اسی زمانہ میں اس نے اپنی تاریخ امم قدیمہ لکھی ہے جس کا نام آثار الباقیہ فی قرون الخالیہ ہے[5]۔ فلک المعالی امیر منوچہر بن قابوس (۴۰۳ھ تا ۴۲۰ھ / ۱۰۱۲ تا ۱۰۲۹) کو شعر و سخن سے خاص شغف تھا اور منوچہری دامغانی نے اسی کے دربار میں تربیت حاصل کی تھی[6]۔

آل مامون کے محاسن و مآثر سے ادب و تاریخ کی کتابیں مالا مال ہیں۔ یہ خاندان خوارزم میں حکمراں تھا اکثر مورخین نے اس کا نام خوارزم شاہیان قدیم لکھا ہے۔ علی بن مامون بن محمد خوارزم شاہ کے زمانہ میں بو علی سینا خوارزم میں آیا تھا۔ اور بادشاہ نے اس کی نہایت قدردانی کی تھی۔ ابو الحسین السہیلی جو مشہور فقیہ و ادیب ہے، اس کا اور اس کے بھائی ابو العباس مامون بن خوارزم شاہ کا وزیر تھا۔ ابو العباس اس خاندان میں سب سے زیادہ علم دوست اور ہنر پرور بادشاہ ہوا ہے۔ ابو الخیر خمار۔ ابو ریحان البیرونی۔ بو علی سینا وغیرہ (جن کا شمار اسلام کے حکمائے اولین میں ہوتا ہے) یہ سب اس کے دربار میں جمع تھے[7] اس کے نام پر بہت سی

---

[1] آثار الباقیہ [2] عتبی ترجمہ اردو [3] دولت شاہ صفحہ ۱۰ [4] براؤن جلد ۱ [5] دولت شاہ صفحہ ۱۶ [6] چہار مقالہ

کتابیں لکھی گئی ہیں۔ امام ابوالمنصور ثعلبی نے بھی ایک کتاب الطوآئف والظرائف کو اس کے نام سے نامزد کیا ہے[ف]
سجستان و نیمروز میں سلطان محمود کے وقت خلف بانو بن احمد کی حکومت تھی اس کا سلسلہ سلاطین آل صفار سے ملتا ہے۔ خلف بانو اپنے زمانہ کا سب سے بڑا علم دوست بادشاہ ہوا ہے۔ اُس کی قدردانی سے اطراف واکناف کے اہل کمال دربار سجستان میں جمع ہو گئے تھے۔ شعرائے عرب کی کثیر جماعت اس کے دربار میں موجود تھی۔ مشہور ادیب بدیع الزماں ہمدانی اس کا ندیم خاص تھا۔ ابوالفتح بستی نے اس کی مدح میں تین شعر موزوں کئے تو صلہ میں تین سو دینار سُرخ عطا کئے تھے۔ اس عہد کے بڑے بڑے علمار کو جمع کر کے اُس نے قرآن مجید کی ایک ایسی تفسیر لکھوائی تھی کہ اُس میں صرف ونحو حدیث فقہ کلام کے جمیع مسائل درج تھے۔ اُس کی تالیف میں تیس ہزار دینار سرخ کا صرفہ ہوا تھا۔ مورخ عتبی نے نیشاپور کے کتب خانہ صابونی میں اس تفسیر کا ایک نسخہ بچشم خود دیکھا تھا۔ اس کا بیان ہے کہ یہ کتاب اس قدر کبیر الحجم ہے کہ ایک کاتب تمام عمر اگر اس کو لکھتا رہے تب بھی تمام کتاب کا نقل ہونا محال ہے[ف۱]۔ ابوالشرف ناصح نے یمینی کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ یہ تفسیر ۵۴۵ھ تک نیشاپور میں تھی۔ اس کے بعد صفہان میں منتقل ہو گئی اور وہاں آل خجند کے کتب خانہ میں محفوظ تھی۔ اور بڑی تقطیع کی ایک سو جلدیں تھیں[ف۳]۔

اسلام کا نامور حکیم شیخ الرئیس بوعلی سینا (ولادت ۳۷۳ھ ۹۸۳ وفات ۴۲۷ھ ۱۰۳۵) اسی زمانہ میں پیدا ہوا اور اسی سرزمین میں عمر بسر کی۔ تحصیل علم سے فراغت پانے کے بعد بخارا میں آیا۔ اور ایک مدت تک نوح بن منصور کے دربار میں رہا۔ اسی زمانہ میں امیر ابوالحسن العروضی کی فرمایش سے کتاب المجموع تصنیف کی جس میں ریاضیات کے سوا فلسفہ کے جملہ علوم مذکور ہیں۔ اس کے بعد نوح بن منصور کے ایما سے پانچ جلدوں میں طبی اصطلاحات کو جمع کیا اور اس کا نام لغات سدیدیہ رکھا۔ منصور کی وفات کے بعد بخارا سے نکل کر خوارزم میں آیا اور کچھ عرصہ تک وزیر ابوالحسن السہیلی کے یہاں مقیم رہا۔ اس زمانہ میں علم منطق اور علم کیمیا میں دو کتابیں لکھیں اور اُن کو وزیر ابوالحسن کے نام سے موسوم کیا۔ امیر قابوس کے زمانہ میں خوارزم سے طبرستان میں آیا۔ قابوس نے اس کی خوب قدر ومنزلت کی۔ اُسی زمانہ میں اُس نے اپنی مشہور تصنیف کتاب الشفار کو

ف۱ بروکلمن جلد ۱ صفحہ ۲۸۶ ف۲ عتبی ترجمہ اردو صفحہ ۹۲ ۔ ف۳ روضۃ الصفار جلد ۴ صفحہ ۱۰

اٹھارہ مہینہ میں تصنیف کیا۔ علاءالدولہ قابوس کا بھائی تھا۔ اس کی فرمایش سے فارسی میں ایک کتاب لکھی جو حکمت علائیہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں فلسفہ کے جملہ علوم درج ہیں۔ قابوس کی وفات کے بعد شیخ ہمدان میں چلا آیا اور آل بویہ کی سرپرستی میں زندگی کا بقیہ حصّہ گذار دیا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اس زمانہ میں بادشاہ بادشاہزادے، وزیر امیر سب صاحبِ فضل وکمال تھے اور وسط ایشیا کے ہر گوشہ میں علمی مذاق پھیلا ہوا تھا۔ حکومت آل سامان کے ختم ہوجانے سے سلطان محمود کی حکومت خراسان میں پھیل گئی سنہ ۴۰۳ھ/۱۰۱۲ء میں سجستان ونیمروز سنہ ۴۰۵ھ/۱۰۱۴ء میں جوزجان سنہ ۴۰۶ھ/۱۰۱۵ء میں خوارزم فتح ہوئے اور یہاں کی حکومتیں تباہ ہوگئیں۔ آل دشمگیر آل سلجوق وآل بویہ نے اطاعت قبول کرلی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطان محمود کی سلطنت مشرق میں سب سے بڑی تسلیم کرلی گئی۔ اور ان برباد شدہ حکومتوں میں جو ارباب کمال جمع تھے وہ سب آل سبکتگین کے سایۂ عاطفت میں چلے آئے۔

مؤرخین نے آل سبکتگین کو اپنے زمانہ کا سب سے بڑا علم دوست اور مربی علم وفن تسلیم کیا ہے۔ اس خاندان کو نشر علوم کا خاص خیال تھا۔ اُس کے عہد کے تمام مشاہیر فضل وکمال اس خاندان کے فیض کرم سے بہرہ ور ہو رہے تھے۔ اشاعت تعلیم کے لئے اس خاندان نے اپنے قلمرو میں سینکڑوں مدارس قایم کئے تھے۔ اور اس بارے میں ایک قابل امتیاز خصوصیت یہ ہے کہ امیر نصر بن سبکتگین نے دنیائے اسلام میں سب سے پہلے مدرسہ تعمیر کرایا تھا۔ اس کے بعد مصر اور بغداد میں مدارس کی بنیاد پڑی ہے۔

آل سبکتگین کی سلطنت میں تین شہر صدر مقام تھے۔ غزنیں دارالحکومت تھا۔ نیشاپور میں خراسان کا سپہ سالار اور لاہور میں ہندوستان کے گورنر رہا کرتے تھے۔ یہ تینوں مقام اپنے زمانۂ عروج میں علم وفن کے مرکز تھے۔ نیشاپور کی علمی حالت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ دنیائے اسلام میں سب سے پہلے نیشاپور میں مدرسہ قایم ہوا ہے۔ غزنویوں کے زمانہ میں نیشاپور میں کئی مدرسے جاری تھے۔ نصر بن سبکتگین کا مدرسہ سعیدیہ، امام ابن خورک کا مدرسہ نصریہ، امام ابوالقاسم کا مدرسہ بیہقیہ وغیرہ۔ یہ مدرسے اس قدر وسیع پیمانہ پر قایم تھے کہ مورخین نے ان کو "امہات المدارس" کا لقب دیا ہے[1]۔ طغرل بیگ سلجوقی نے جب نیشاپور فتح کیا تو اُس نے بھی

---

[1] الخطط والآثار جلد ۲ صفحہ ۳۶۳

یہاں ایک مدرسہ تعمیر کرایا۔ حکیم ناصر خسرو نے اپنے سفرنامہ میں اس کا ذکر اس طرح کیا ہے:

"روز شنبہ یازدہم شوال سنہ سبع وثلثین واربعمائہ وارد نیشاپور شدم۔ چہارشنبہ آخر ایں ماہ کسوف بود۔ وحاکم زمان طغرل بک محمد بود برادر جغری بک۔ بنائے مدرسہ فرمودہ بود نزدیک بازار سراجان۔ وآں را عمارت می کردند۔"[1]

آل سبکتگین کے عہد میں بڑے بڑے ارباب فضل وکمال لاہور میں آکر سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ ابوالحسن علی بن عثمان الہجویری اور شیخ فریدالدین زنجانی جو مشاہیر مشایخ صوفیہ سے ہیں اسی زمانہ میں یہاں آئے اور اسی جگہ انتقال فرمایا۔ ان کے مزارات آج تک زیارت گاہ خاص وعام ہیں[2]۔ مسعود سعد سلمان اور ابوالفرج رونی کے خاندان عرصہ سے لاہور میں آباد تھے۔ اور اسی شہر کے اطراف میں ان کی پیدایش واقع ہوئی تھی۔ ابوعبداللہ النکتی اور حمیدالدین مسعود بن سعد شالی کوب لاہور کے باشندے اور فارسی زبان کے بلند پایہ شاعر تھے۔ پہلا سلطان مسعود کے زمانہ میں اور دوسرا سلطان شہاب الدین غوری کے عہد میں گزرا ہے[3]۔ مشہور ادیب ابونصر فارسی لاہور میں مدتوں مقیم رہا ہے۔ زمانہ قیام میں اس نے ایک مدرسہ تعمیر کرایا تھا۔ جو صدیوں قایم رہا اور اس میں تعلیم جاری تھی[4]۔

آل سبکتگین سے پہلے غزنین کی معمولی حالت تھی۔ سلطان محمود کے زمانہ میں اس کو وسعت و رونق حاصل ہوئی ہے۔ سلطان جب قنوج ومتھرا کی مہم سے واپس آیا تو یہاں ایک عالی شان مسجد تعمیر کرائی اور اس میں ایک مدرسہ بھی قایم کیا۔ اعیان وامرا نے بھی سلطان کی پیروی کی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں غزنین عالیشان عمارتوں اور علمی یادگاروں سے معمور ہو گیا۔ اور ایشیا کے عظیم الشان شہروں میں اس کا شمار ہونے لگا[5]۔ ابن رازی کا بیان ہے کہ سلطان محمود کے زمانہ میں غزنین کی آبادی کئی فرسخ تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی وسعت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس میں بارہ ہزار صرف مساجد و مدارس واقع تھے۔ رفاہ عام کی دیگر عمارات رباطات وخانقاہات وغیرہ کی تعداد ان کے علاوہ تھی[6]۔ غزنین کی یہ رونق بہت کم مدت قایم رہی۔ بہرام شاہ کے زمانہ میں علاءالدین غوری نے

[1] سفرنامہ حکیم ناصر خسرو صفحہ ۳ — [2] مآثر الکرام صفحہ ۶ — [3] عوفی جلد ۲ صفحہ ۷۰ و ۲۱۱
[4] عوفی جلد ۱ — [5] تاریخ فرشتہ جلد ۱ — [6] ہفت اقلیم

جب اُسے فتح کیا تو جلا کر خاک کر دیا اور اسی وجہ سے اس کا لقب "جہاں سوز" مشہور ہو گیا[۱]۔ اس کے بعد غزنین کو پھر کبھی عروج حاصل نہیں ہوا۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ نے اسے ساتویں صدی میں دیکھا تھا۔ اُس کا بیان ہے کہ صرف ایک گوشہ میں آبادی ہی باقی ویرانہ ہے[۲]۔ اِس شہر کی گزشتہ شان و شوکت کو یاد دلانے کے لیے آلِ سبکتگین کے آثار عتیقہ سے اس وقت صرف دو مینار باقی رہ گئے ہیں جن کو سلطان محمود اور اس کے بیٹے مسعود نے اپنی فتوحات کی یادگار میں تعمیر کرایا تھا[۳]۔

آلِ سبکتگین کے زمانہ میں دیگر علوم و فنون کی بہ نسبت فارسی شاعری کو خوب ترقی ہوئی ہے۔ اُس کی تفصیل کو بیان کرنے سے پیشتر فارسی شاعری کا مختصر حال تحریر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ آئندہ اوراق میں فارسی شاعری اور شعرا کے جو حالات مذکور ہوں گے اُن پر اُس تمہید سے نہ صرف روشنی پڑے گی بلکہ فارسی شاعری کا تاریخی سلسلہ مربوط ہو جائے گا۔

عربوں نے جب ایران فتح کیا تو فاتحین کا اثر مفتوح اقوام میں مقناطیسی قوت کی طرح سرایت کر گیا۔ عربی مذہب اور تمدن تمام ملک میں برق و باد کی مانند پھیل گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی زبان اور اُس کے علوم و فنون ماند پڑ گئے۔ اور اُس کی عوض عربی زبان اور اسلامی علوم کی تمام ملک میں اشاعت ہو گئی۔ قریباً دو سال تک یہی کیفیت رہی۔ خلفائے بنی عباس کو جب زوال شروع ہوا اور ایرانی حکام کی بہت سی چھوٹی چھوٹی حکومتیں قایم ہو گئیں۔ تو اُن کی توجہ سے فارسی زبان میں از سرِ نو حس و حرکت پیدا ہوئی اور ان خاندانوں کے سایۂ عاطفت میں اُس کو نشو و نما ہونے لگا۔

فارسی شاعری جو اسلام سے پہلے ایران میں رائج تھی عربی فتوحات کے زمانہ میں اس طرح مٹ گئی کہ اُس وقت نہ تو اِس عہد کے کسی شاعر کا نام ملتا ہے اور نہ دو چار بیت دستیاب ہوتے ہیں۔ موجودہ شاعری کی ابتدا تیسری صدی میں ہوئی ہے۔ کہتے ہیں کہ مامون الرشید جب خراسان میں مقیم تھا تو عباس مروزی نے اُس کی مدح میں ایک فارسی قصیدہ لکھا جس کے صلہ میں مامون نے اُسے ہزار دینار سرخ عطا کیے۔ اور ہزار درہم سالانہ اُس کی تنخواہ مقرر کر دی۔ محمد عوفی کا بیان ہے کہ عہد اسلام میں یہ سب سے پہلا کلام ہے جو فارسی میں موزوں ہوا۔

---

[۱] چہار مقالہ [۲] ابن بطوطہ [۳] رسالہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال جلد ۱۲ حصہ اوّل صفحہ ۲۰۷،

اُس کے بعد تھوڑی مدت تک کسی نے بھی فارسی شاعری کی طرف توجہ نہیں کی یہاں تک کہ طاہر ذوالیمین نے اپنی خود مختار حکومت خراسان میں قایم کر لی۔ یہ خاندان اور اُس کے جانشین آل صفار ایسی سرزمین میں حکمراں تھے جہاں کی زبان فارسی تھی۔ اور اِسی بنیاد پر ان کے درباروں میں بہت سے فارسی شعراء پیدا ہو گئے۔ اُن میں حنظلہ، فیروز مشرقی، محمود وراق اور منجیک چنگزن بہت مشہور ہیں۔

حنظلہ بادغیس کا باشندہ تھا، ۲۱۹ھ میں فوت ہوا ہی[۱]۔ فیروز کے آبا و اجداد دین کے رہنے والے تھے[۲]۔ محمود وراق محمد بن طاہر کے زمانہ میں گزرا ہی[۳] منجیک چنگزن جس کا نام ابوالحسن علی بن محمد ترمذی ہی ملوک صفاریہ کا درباری شاعر تھا۔ احمد صفاری کی مدح میں اُس نے جو قصائد لکھے ہیں وہ مجمع الفصحا میں درج ہیں۔ صفاریوں کی تباہی کے بعد اُمرائے چغانیاں کے دربار میں توسل پیدا کیا اور مدت تک طاہر بن حسین چغانی کا ندیم خاص رہا ہی[۴]۔

اِس وقت تک شاعری کی حالت طفل شیر خوار کے مانند تھی۔ جب سامانیوں کا زمانہ آیا تو اُس نے عہد شباب میں قدم رکھا۔ ملوک سامانیہ نسلاً ایرانی تھے بہرام چوبین سے اُن کا سلسلہ ملتا تھا۔ فارسی اُن کی مادری زبان تھی حکومت جب اُن کے ہاتھ میں آئی تو اُنھوں نے فارسی کو ترقی دینے میں شاہانہ فیاضی سے کام لیا۔ بڑے بڑے شعرا دربار میں جمع کئے اور اُن کی بیش قرار تنخواہیں مقرر کیں۔ ہزار ہا روپیہ صرف کر کے فارسی میں کتابیں لکھوائیں جس کا مختصر تذکرہ اوپر گزر چکا ہی۔ سامانیوں کے دربار میں اگرچہ سینکڑوں شعرا موجود تھے۔ لیکن ان میں جن کو خصوصیت حاصل تھی اُن کے نام نظامی عروضی سمرقندی نے حسب ذیل لکھے ہیں[۵]:

ابوالعباس۔ ابوالمثل۔ ابوالاسحاق۔ ابوشکور بلخی۔ جوئباری۔ ابوالحسن۔ خبازی نیشاپوری۔ شہید بلخی۔ ابوالمویّد۔ ابوعبداللہ فرالادی۔ رودکی۔ دقیقی۔ رابعہ فرداری۔ ابوذر۔ معمر جرجانی۔ ابوالمظفر نصر بن محمد نیشاپوری۔ عمارہ مروزی۔ طخاری۔ مرادی۔

اِن میں سے اکثر شعرا کے حالات اور کلام دونوں مفقود ہو گئے ہیں۔ اس سلسلہ میں شہید اور مرادی قدیم شاعر ہیں۔ رودکی نے اِن کا مرثیہ بھی لکھا ہی جو مجمع الفصحا میں منقول ہی۔ ابوشکور بلخی اور خبازی نیشاپوری

---

[۱] مجمع الفصحا ج ۱ [۲] مجمع الفصحا [۳] مجمع الفصحا [۴] مجمع الفصحا [۵] چہار مقالہ

دونوں معاصر ہیں۔ نوح بن نصر بن احمد سامانی (۳۳۱ھ ۹۴۲ء – ۳۴۳ھ ۹۵۴ء) کے زمانہ میں گزرے ہیں پہلے کا ۳۳۶ھ میں اور دوسرے کا ۳۴۲ھ ۹۵۳ء میں انتقال ہوا ہی[1]۔ ابوالمؤید بلخ کا باشندہ تھا۔ اس نے حکایات یوسف زلیخا کو سب سے پہلے نظم کیا ہی[2]۔ سوائے اس کے اُس نے ملوک عجم کی ایک تاریخ بھی لکھی ہے جس کا نام شاہنامہ ہی اور اس میں ایران قدیم کے حالات کمال تفصیل کے ساتھ تحریر کئے ہیں۔ عنصر المعالی کیکاؤس بن اسکندر بن وشمگیر نے قابوس نامہ میں اس کا ذکر کیا ہی[3]۔

سامانی شعرا میں رودکی اور دقیقی کو نہایت شہرت ہی۔ اور حقیقت یہ ہی کہ انھیں کی وجہ سے سامانیوں کا نام زندہ جاوید ہو گیا ہے۔ ابوعبداللہ محمد رودکی نخشب کے قریہ رودرک کا باشندہ اور نصر بن احمد سامانی کے دربار کا ملک الشعرا تھا۔ تمام تذکرہ نویس اُس کو فارسی شاعری کا بانی اوّل اور شعرا کا ابوالآبا کہتے ہیں سب سے پہلے اُس نے اپنے دیوان کو مرتب و مدون کیا ہی اُس کا دیوان ایران میں چھپ گیا ہی اور اُس میں تمام اصناف سخن مثلاً قصیدہ غزل قطعہ رُباعی مرثیہ وغیرہ موجود ہیں۔ نصر بن احمد کے فرمایش سے اُس نے کلیلہ دمنہ کی حکایات بھی نظم کی تھیں۔ لیکن مدت ہوئی کہ یہ کتاب زمانہ کے ناقدرہاتھوں سے برباد ہو گئی ہے۔ اور اُس وقت اِس کے صرف دس بارہ شعر ملتے ہیں جن کو حکیم اسدی طوسی نے اپنی لغات میں بطور شواہد کے نقل کیا ہی ۳۰۶ھ ۹۱۸ء میں اُس نے وفات پائی[4]۔

ابوالمنصور محمد بن احمد الدقیقی سمرقند کا باشندہ ہے۔ مدت تک اُمرائے چغانیان کے دربار میں رہا۔ امیر نوح بن منصور سامانی (۳۶۶ھ ۹۷۶ء – ۳۸۷ھ ۹۹۷ء) جب تخت نشین ہوا تو دقیقی چغانیاں سے بخارا میں آیا۔ بادشاہ نے جب اُس کے کمالات کو دیکھا تو دربار کا ملک الشعرا مقرر کیا اور تاریخ ملوک عجم کو نظم کرنے کی خدمت اُس کے سپرد کی اس واقعہ کے بعد دقیقی بہت کم مدت زندہ رہا ۳۹۱ھ میں اُس کے ایک غلام نے اُس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا[5]۔

سامانیوں کے بعد غزنویوں کا دور آتا ہی۔ ان کے عہد میں فارسی شاعری انتہائے شباب پر پہونچ گئی

---

[1] مجمع الفصحا جلد ا
[2] مثنوی یوسف زلیخا فردوسی طبع یورپ
[3] قابوس نامہ طبع طہران
[4] تذکرہ دولت شاہ
[5] تذکرہ دولت شاہ

تھی۔ سینکڑوں شاعر اُن کے فیضان کرم سے بہرہ ور ہوتے تھے۔ اور سرپرستی اور فیاضی کے بدولت شاعری کو بے انتہا وسعت حاصل ہوگئی۔ اور اس قدر ادبی ذخیرہ فراہم ہوا کہ اُس کی تفصیل بیان کی جائے تو اُس کے لئے ایک طومار کی ضرورت ہے۔ مجمع الفصحا میں لکھا ہے[۵]

"چوں نوبت دولت ملوک آل ناصر غزنویہ بلند آوازہ آمد سلطان محمود بن ناصرالدین سبکتگین در تربیت شعراء کوشیدہ و بہ تکمیل مستعدان عہد جہد کرد۔ چناں کہ ثروت حکیم ابوالقاسم عنصری از دولت عبداللہ الرودکی درگذشت و چہار صد تن شاعر ماہر قادر دراں والا دولت تربیت یافتند۔ و وے ملک الشعراء بالاستقلال و استحقاق ہمہ بود۔ و پس از سلطان محمود نیز فرزندان وے جمعی رامربی و مشوق بودند"

نظامی عروضی سمرقندی نے شعرائے آل سبکتگین کی یہ تفصیل بیان کی ہے۔ عنصری۔ عسجدی۔ فرخی۔ بہرامی زینتی۔ بزرجمہر قائینی۔ مظفری۔ منشوری۔ منوچہری۔ مسعودی۔ قصارامی۔ ابوحنیفہ اسکاف۔ راشدی۔ ابوالفرج رونی۔ محمد ناصر۔ مسعود سعد سلمان۔ شاہ ابو رجا۔ احمد خلف۔ عثمان مختاری۔ مجدود السنائی۔

اِن کے حالات ہم آیندہ اوراق میں موقع بموقع بیان کریں گے۔ اِس مقام پر مختصر الفاظ میں اُن قابل لحاظ ممیزات کو بیان کرتے ہیں جو آل سبکتگین کے عہد میں فارسی شاعری میں پیدا ہوئے تھے۔

(۱) اِس وقت تک فارسی شاعری کو صرف مضمون اور فن کی حیثیت سے ترقی ہوئی تھی۔ لیکن زبان شناسی نہ تھی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ سامانی اور غزنوی خاندانوں کے مرکز حکومت ایران سے باہر تھے۔ اور اُن کے دربار میں جو شعراء تھے۔ وہ بھی عموماً انھیں صوبجات کے رہنے والے تھے۔ مثلاً رودکی نخشب کا اور بہرامی سرخس کا باشندہ تھا۔ دقیقی اور عسجدی مرو کے رہنے والے تھے۔ عنصری اور فرخی کے وطن بلخ و سیستان تھے ابوالفرج اور مسعود سعد سلمان کی پیدائش ہندوستان میں ہوئی تھی۔ مختاری اور سنائی کو غزنین میں نشو و نما حاصل ہوا تھا۔ آل سلجوق نے جب اِس ملک پر قبضہ کیا اور اُن کی سرپرستی میں ایران میں شاعری پھیلی تو اُس عہد سے زبان میں لطافت و شیرینی پیدا ہوئی اور محاورات و مصطلحات جو خاص اہل زبان کا خاصہ ہیں شاعری میں

---

[۵] مجمع الفصحا جلد ا

داخل ہوئے۔

(۲) اس وقت تک شاعری کے صرف دو صنف قصیدہ و مثنوی کو رواج عام حاصل ہوا تھا۔ قصاید مداحی سے مخصوص تھے۔ مثنوی کو شعراء نے قصص و حکایات تک محدود کر دیا تھا۔ رودکی۔ ابو المویدبلخی۔ اور عمعق بخاری سے مثنوی گوئی کی ابتداء ہوئی ہی۔ رودکی نے کلیلہ دمنہ ابو المویّد اور عمعق نے حکایات یوسف زلیخا کو نظم کیا ہی۔[1]

شعراء آل ناصر کی جدت پسند طبائع نے ان دونوں اصناف میں بہت سے جدید مضامین ادا کئے ہیں جس کی وجہ سے شاعری میں بے حد وسعت پیدا ہو گئی ہی۔ مثلاً شاعری کی سب سے بڑی قسم رزمیہ ہی۔ فردوسی نے شاہنامہ لکھکر رزمیہ نظم کو اس قدر مکمل کر دیا کہ اُس پر آج تک ایک حرف کا اضافہ نہ ہو سکا۔ اسی عہد میں حکیم سنائی نے حدیقہ اور اُسی قبیل کی دوسری مثنویوں کو لکھکر اخلاقی اور صوفیانہ شاعری کا سنگ بنیاد رکھا ہی جس کی تکمیل زمانہ مابعد میں شیخ عطار اور عارف روم نے کی ہی اکثر شعراء نے قصاید میں اخلاقی اور تاریخی مضامین ادا کئے ہیں۔ حکیم عنصری نے ایک طولانی قصیدہ میں سلطان محمود کے تمام فتوحات کو نظم کیا اور اُس کا نام تاج الفتوح رکھا ہی۔[2] حکیم سنائی کا قصیدہ رموز الانبیا اور کنوز الاولیا طبقہ صوفیہ میں نہایت مشہور رہی اس میں سلوک کے معارف و حقایق اور لطائف و دقایق مذکور ہیں مولانا جامی نے اُس کے ابیات کی تعداد ایک سو اسّی بیان کی ہی۔[3]

(۳) اس وقت تک فارسی شاعری کے قواعد و ضوابط کی تدوین نہیں ہوئی تھی۔ سب سے پہلے غزنویوں کے عہد میں اُستادانِ فن نے اُن کو مرتب و مدوّن کیا ہی حکیم بہرامی سرخسی نے فن شعر کے متعلق کئی کتابیں لکھی ہیں۔[4] غایۃ العروضین اور کنز القافیہ میں علم عروض و قافیہ کے اصول و فروع جمع کئے ہیں۔[5] خجستہ نامہ میں نقد شعر اور اُس کے اصناف و انواع کو بیان کیا ہے۔[6] حکیم فرخی نے علم بیان و معانی میں ایک ضخیم کتاب لکھی ہی جس کا نام

---

[1] فردوسی نے اپنی مثنوی یوسف زلیخا میں اُن دونوں مثنویوں کا ذکر کیا ہی مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو کتاب ہفت آسمان جس میں مثنوی گو شعراء کے تاریخی حالات مذکور ہیں [2] دولت شاہ [3] نفحات الانس صفحہ ۲۹۰ [4] بہرامی کی تصنیفات اس وقت ناپید ہیں ساتویں صدی تک موجود تھیں شمس الدین قیسی نے اِن کو دیکھا ہی۔ اور اپنی کتاب المعجم فی معائر اشعار العجم میں اِن سے مضامین اقتباس کئے ہیں [5] چہار مقالہ [6] عوفی جلد ا

ترجمان البلاغت ہی۔ یہ کتابیں اُسی زمانہ میں شاعری کا نصاب مقرر ہو گئی تھیں۔ جو شخص شاعر ہونا چاہتا تھا اُسے اِن کتابوں کے ذریعہ شاعری کی تعلیم حاصل کرنا لازمی امر تھا۔ نظامی عروضی سمرقندی لکھتا ہی:

"اما شاعر بدیں درجہ نرسد الا کہ در عنفوان شباب در روزگار جوانی بست ہزار اشعار متقدمین یاد گیرد و ہزار کلمہ از آثار متاخرین در پیش چشم کند و پیوستہ دواوین استادان خواند۔ و عروضی بخواند و گرد تصانیف استاد ابوالحسن بہرامی سرخسی گردد۔ و مانند غایۃ العروضیین و کنز القافیہ و نقد معانی و نقد الفاظ و سرقات و تراجم و انواع ایں علوم بخواند۔"

بابِ دوم

امیر ناصر الدین سبکتگین اور اُس کے فرزند

امیر سبکتگین کا مذاقِ علمی اور اس کے عہد کے ارباب کمال ابو الفتح بستی، حکیم کسائی مروزی، امیر سبکتگین کے لڑکے، امیر اسمٰعیل، امیر یوسف، امیر نصر، مدرسہ سعیدیہ، دنیائے اسلام کا پہلا مدرسہ، امام ابو النصور ثعلبی، کتاب الغرر فی سیر الملوک۔

امیر سبکتگین شجاع عادل عابد و زاہد اور ذی علم بادشاہ ہوا ہی۔ اشاعت علم سے اس کو خاص رغبت تھی۔ اپنے لڑکوں کو اعلیٰ درجہ کی تعلیم دلوائی تھی۔ اور انھیں ترویج علم اور ارباب فضل و کمال کی قدر دانی پر ہمیشہ آمادہ کیا کرتا تھا۔ مؤرخ فرشتہ نے غیاث خوندمیر کی کتاب مآثر الملوک سے حسب ذیل واقعہ نقل کیا ہے جس سے اُس کا مذاق علمی ظاہر ہوتا ہی۔

"سلطان محمود نے اپنے ایام جوانی میں کہ جس وقت اپنے پدر والا گوہر کے ظلِ عنایت میں تھا ایک باغ جنت نشان نہایت زیب و زینت کے ساتھ تیار کرایا۔ جب وہ ہر طرح سے آراستہ ہو گیا تو اپنے پدر بزرگوار اور ارکان دولت کو اُس کے اندر بلوایا۔ اُس وقت امیر ناصر الدین سبکتگین

---

[1] دولت شاہ [2] چہار مقالہ

نے فرمایا کہ اے فرزند یہ باغ و مکان تو حقیقت میں بہت مطبوع و مقبول ہیں لیکن ہماری ملازمین
سے اکثر ایسے بنا سکتے ہیں سلاطین کو شایان ہے کہ ایسی عمارت اور ایسا باغ بنائیں کہ اور لوگ
مثل اُس کے بنانے سے عاجز آئیں سلطان محمود نے آداب بجا لا کر عرض کیا کہ وہ کیسا باغ اور
کیسی عمارت ہی۔ فرمایا کہ اہلِ علم و فضل کے دلوں کی تعمیر اور اُن کے دلوں کی زمین میں نہال
احسان لگانا اور ثمرۂ سعادت حاصل کرنا اور تا قیامت ذکر جمیل صفحۂ روزگار پر چھوڑ جانا ہے"[1]

امیر سبکتگین کے دربار میں اکثر ارباب علم[2] جمع تھے۔ اور اُس نے سلطنت کے بڑے بڑے عہدوں پر انہیں مامور کیا تھا۔ الشیخ الجلیل مجد الدین ابو الفتح بستی دربار کا میر منشی تھا۔ سبکتگین کی وفات کے بعد سلطان محمود کے زمانہ میں بھی اس نے دو سال تک بعض مہام سلطنت انجام دیئے۔ یہ شخص علوم معقول کا زبردست عالم ہوا ہی۔ عربی فارسی میں اُس کے دو دیوان ہیں جو حقایق اور معارف سے مالا مال ہیں۔ ایک مطول قصیدہ میں زہد و تقوی اور ترک دُنیا کے مضامین کو بیان کیا ہے۔ یہ قصیدہ عرب و عجم میں نہایت مقبول ہُوا ہی۔ اور ملک الشعرا بدر الدین جاجرمی نے اِس کا نظم فارسی میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ مطلع یہ ہی ؎

زیادة المرء فی دنیاه نقصان — و ربحه غیر محض الخیر خسران

ابو الفتح بستی نے ۴۳۰ھ ۱۰۳۸ء میں انتقال کیا۔ ملک عماد مروزی نے اُس کی تاریخ وفات حسب ذیل لکھی ہی ؎

شیخ عالی قدر مجد الدین ابو الفتح آنکہ بود — مقتدائے اہلِ فضل و سرورِ اہلِ کلام
چار صد با سی چو از تاریخ ہجرت در گذشت — در مہِ شوال رحلت کرد از دار السّلام

حکیم ابو الحسن الکسائی[3] مرو کا باشندہ تھا۔ آلِ سامان کے چوتھے بادشاہ امیر نوح بن نصر کے زمانہ میں ۳۴۱ھ ۹۵۲ء میں پیدا ہوا۔ عوفی نے لکھا ہی کہ پچپن سال کی عمر میں اِس نے وفات پائی اِس اعتبار سے ۳۹۶ھ ۱۰۰۵ء میں

---

[1] ترجمہ اُردو تاریخ فرشتہ مسمی تحفة الملوک طبع بجنور صفحہ ۱۱ فارسی ایڈیشن لکھنؤ جلد ۱ صفحہ ۲۱ [2] یتیمة الدہر صفحہ ۲۰۴ و ۲۳۱ عوفی جلد ۱ صفحہ ۴ و دولت شاہ صفحہ ۲۶ و ۲۷ و ۲۱۹ مجمع الفصحا جلد ۱ صفحہ ۷۰ براون جلد ۲ صفحہ ۹۹ [3] عوفی جلد ۲ صفحہ ۲۳ و ۳۹ چہار مقالہ صفحہ ۲۶ لغات اسدی صفحہ ۲۷ مجمع الفصحا جلد ۱ صفحہ ۴۸۲

اُس کا انتقال ہوا ہی۔ عوفی نے اِس کا ایک مطول قصیدہ نقل کیا ہی جس کے اشعار سے ثابت ہوتا ہی کہ یہ قصیدہ ۳۹۱ھ/۱۰۰۱ء میں تصنیف ہوا ہی۔ پس یہ بات یقینی ہی کہ ۳۹۱ھ/۱۰۰۱ء میں کسائی بقید حیات موجود تھا کسائی کا زمانہ شباب سبکتگین کے عہد میں گذرا ہے۔ اور سلطان محمود کا ابتدائی زمانہ بھی اپنی اخیر عمر میں دیکھا ہے۔ امیر سبکتگین کی مدح میں متعدد قصائد لکھے ہیں حکیم ناصر خسرو اس کا معاصر تھا۔ دونوں میں شاعرانہ نوک جھوک ہوا کرتی تھی۔ اس بنا پر ناصر خسرو نے اُس کے کئی قصائد کا جواب بھی لکھا ہی۔

امیر سبکتگین کے چار لڑکے تھے۔ اسمٰعیل، یوسف، نصر، محمود اور یہ سب عالم فاضل اور ہنر پرور تھے۔ مؤرخ ابن اثیر نے اسمٰعیل کی نسبت لکھا ہی کہ نیک اور فیاض آدمی تھا نظم و نثر میں اُس کو اعلیٰ درجہ کی لیاقت حاصل تھی۔ جمعہ کی نماز کے لئے جب جامع مسجد میں آتا تو اکثر اوقات اپنے تصنیف کئے ہوئے خطبے پڑھا کرتا تھا[۱]۔ ابو المظفر یوسف بن سبکتگین کو فارسی شعر و سخن سے غایت دلچسپی تھی۔ لیبی اولیبی اس کا ندیم خاص تھا[۲]۔ فرخی عنصری اور دیگر شعرا در بار جب اِس کی مدح میں قصائد لکھتے تو اُنھیں صلۂ بکراں دیا کرتا تھا[۳]۔

ابوالمظفر نصر۔ امیر سبکتگین کا منجھلا لڑکا تھا۔ سلطان محمود نے ۳۸۹ھ/۹۹۸ء میں جب فایق کو شکست دے کر خراسان پر قبضہ کیا تو نصر کو وہاں کا سپہ سالار مقرر کیا[۴]۔ اس تقریب سے نصر قریباً چھ سال تک نیشاپور میں مقیم رہا۔ ۳۹۵ھ/۱۰۰۴ء میں جب ابراہیم منتصر بن نوح سامانی کا خراسان میں استیصال ہوگیا اور ملک کے تمام فتنہ و فساد تمام ہوگئے۔ تو محمود نے نصر کو غزنین میں بلالیا[۵]۔ نصر اِس واقع کے بعد قریباً پندرہ سال تک زندہ رہا۔ ۴۱۰ھ/۱۰۱۹ء یا ۴۱۲ھ/۱۰۲۱ء بمقام غزنین اس کا انتقال ہوا[۶]۔ نصر کو علوم عربیہ میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ اور اُن کے احیا اور نشر و ترویج میں بدرجۂ غایت حصہ لیا کرتا تھا سپہ سالار کے زمانہ میں نیشاپور میں اس نے ایک عالیشان مدرسہ تعمیر کرایا تھا جس کا نام مدرسہ سعیدیہ تھا۔ اِس میں بڑے بڑے محدثین و فقہا درس و تدریس کے لئے مقرر

---

[۱] ابن اثیر جلد ۹ صفحہ ۹۲ [۲] عوفی جلد ۱ صفحہ ۲۰ [۳] مجمع الفصحا، جلد ۱ صفحہ ۴۳۹ [۴] عتبی صفحہ ۷۸، ۹۸

[۵] نصر کی تاریخ وفات کسی مؤرخ نے بیان نہیں کی ہی۔ [۶] عتبی نے اپنی کتاب کے خاتمہ میں بلا قید تاریخ اِس کے انتقال کا تذکرہ کیا ہی یہ کتاب ۴۱۱ھ کے اوائل میں اختتام کو پہونچی ہی اِس لئے قوی گمان یہ ہوتا ہی کہ ۴۱۰ھ کے اخیر میں یا ۴۱۱ھ کے اوائل میں اس نے وفات پائی ہی

گئے تھے تعلیم مفت دی جاتی تھی۔ طلبا کی رہایش اور خور و نوش کا بھی انتظام تھا۔ اخراجات کے لیے متعدد دیہات و قصبات وقف کر رکھے تھے۔ مؤرخین نے اِس کو اسلام کے امہات المدارس میں شمار کیا ہے[۵]۔ اور اسلامی دُنیا میں یہ پہلا مدرسہ ہے اِس کے بعد بغداد مصر اور دیگر بلادِ اسلام میں مدارس تعمیر ہوئے ہیں[۶]۔

امام ابوالمنصور ثعلبی کی سکونت نیشاپور میں تھی۔ نصر اپنے زمانۂ حکومت میں اُن کے ساتھ بے حد مراعات سے پیش آیا کرتا تھا۔ امام صاحب نے اُس کی فرمایش سے علم تاریخ میں ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام کتاب الغرر فی سیر الملوک ہے۔ اِس میں ابتدائی تخلیق عالم و آدم سے لے کر سلطان محمود کے جلوس تک جمیع اقوام عالم کے حالات کمال شرح و بسط سے لکھے ہیں۔ یہ کتاب مضامین کے اعتبار سے حسب ذیل ابواب پر منقسم ہے۔

(۱) تاریخ انبیاء علیہ السلام
(۲) تاریخ ملوک الفرس
(۳) تاریخ ملوک الفراعنہ
(۴) تاریخ ملوک بنی اسرائیل
(۵) تاریخ ملوک الحمیر
(۶) تاریخ ملوک عرب الشام
(۷) تاریخ ملوک عرب العراق
(۸) تاریخ ملوک الروم والافرنج

۵؎ تاریخ سلاطین غزنویہ و روضۃ الصفا صفحہ ۹۸ مقریزی جلد ۲ صفحہ ۶۳ ۳ سیوطی جلد ۲ صفحہ ۱۸۵ ۶؎ دنیائے اسلام میں سب سے پہلے کون سا مدرسہ قایم ہوا۔ اِس عنوان پر اسلام کے ہر ادبی مؤرخ نے بحث کی ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ اسلام میں سب سے پہلے خواجہ نظام الملک طوسی نے مدرسوں کی بنیاد ڈالی ہے مستشرقین یورپ بیان کرتے ہیں کہ اسلام کا پہلا مدرسہ مامون نے اپنی ولی عہدی کے زمانہ میں خراسان میں قایم کیا تھا۔ لیکن اس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا ہے جرجی زیدان اور علامہ شبلی نے اس موضوع پر کس قدر تفصیل سے بحث کی ہے جو اُن کی تصنیفات میں مرقوم ہے تاریخ تمدن الاسلامی جلد ۳ صفحہ ۲۳۰) اور اسلامی مدارس مندرجۂ رسائل شبلی صفحہ ۶۵ ۳) حال میں مولوی عبدالرزاق کانپوری نے بھی نظام الملک طوسی کی سوانح عمری صفحہ (۶۴۰) میں مدرسہ نظامیہ کے حالات کو بیان کرتے ہوئے اِس مسئلہ پر قلم اُٹھایا ہے۔ ان تینوں مصنفین کا ماخذ ایک ہے اور یہ تمام مضامین ابن خلکان مقریزی اور سیوطی کی تصنیفات سے نقل کیے ہیں (وفیات الاعیان جلد ۱ صفحہ ۴۸۲۔ الخطط والآثار جلد ۲ صفحہ (۳۶۳) حسن المحاضرہ جلد ۲ صفحہ (۱۶۸) و صفحہ (۱۸۵) مولوی عبدالرزاق کا مضمون چوں کہ سب کے بعد لکھا گیا ہے۔ اِس لئے اِس میں زیادہ جامعیت ہے۔ اور اِس میں قدامت و تاریخ تعمیر کے لحاظ سے مدارس کا سلسلہ قایم کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے۔

(۹) تاریخ ملوک الہند
(۱۰) تاریخ ملوک الترک
(۱۱) تاریخ ملوک الصین
(۱۲) سیرت جناب رسول اللہ صلعم
(۱۳) تاریخ خلفائے راشدین
(۱۴) تاریخ ملوک بنی اُمیہ
(۱۵) تاریخ خلفائے بنی عباس
(۱۶) اخبار امرائے برامکہ
(۱۷) تاریخ ملوک طاہریہ
(۱۸) تاریخ ملوک سنجریہ (آل صفار)
(۱۹) تاریخ ملوک سامانیہ
(۲۰) اخبار ملوک حمدانیہ
(۲۱) اخبار ملوک بویہ
(۲۲) اخبار امیر ناصر الدین سبکتگین

موسیو روئبزگ (M. Roibzig) نے اس کتاب کے باب دوم کو جس میں قدیم شاہان ایران کے حالات ہیں سنہ ۱۸۹۱ء میں بمقام پیرس چھپوایا ہے اس کے ساتھ فرانسیسی ترجمہ بھی ہے جس کا عنوان یہ ہے: "کامل کتاب نایاب ہے ہاں اس کا ایک نفیس نسخہ فرانس کے کتب خانہ ملی میں محفوظ ہے"۔

(بقیہ صفحہ سابق) الحاکم بامر اللہ نے ۳۹۵ھ میں ایک مدرسہ مصر میں تعمیر کرایا یہ سب سے پہلا مدرسہ ہے جو سلطنت کی طرف سے رعایا کے لئے قایم ہوا ہے۔ اس کے بعد نیشاپور کے باشندوں نے ایک مدرسہ قومی چندہ سے امام ابو بکر فورک المتوفی ۴۰۶ھ کے لئے قایم کیا۔ اُس کے بعد نیشاپور میں ایک اور مدرسہ بیہقیہ قایم ہُوا۔ اِس کے مدرس اعظم امام ابو القاسم اسکاف تھے۔ بعض مؤرخوں نے اس کو اسلامی دُنیا کا پہلا مدرسہ لکھا ہے۔ ۴۱۰ھ میں سلطان محمود نے غزنین میں ایک مدرسہ جاری کیا۔ محمود کی تقلید میں نصر بن سبکتگین نے بھی نیشاپور میں ایک مدرسہ تعمیر کرایا اور مدرسہ سعیدیہ اس کا نام رکھا۔ اُن کے بعد نیشاپور میں ایک اور مدرسہ امام ابو اسحٰق اسفرائینی المتوفی ۴۱۸ھ کے لئے قایم ہوا۔ جرجی زیدان نے لکھا ہے کہ مدرسہ نظامیہ میں طلبا کو مفت تعلیم دی جاتی تھی۔ اِس نوعیت کے لحاظ سے یہ پہلا مدرسہ ہے۔

مذکورۂ بالا اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ نصر کا مدرسہ ۴۱۰ھ کے بعد تعمیر ہوا ہے۔ اگرچہ کسی مؤرخ نے اس کی تاریخ تعمیر صراحت کے ساتھ بیان نہیں کی ہے۔ تاہم اِس پر سب متفق ہیں کہ نصر نے اُس کو اپنی سپہ سالاری کے زمانہ میں جب کہ وہ نیشاپور میں رہا کرتا تھا تعمیر کرایا ہے۔ مؤرخ عتبی نصر کا ہمعصر ہے اُس کی تصریحات سے ظاہر ہے کہ ۳۸۹ھ سے ۳۹۵ھ تک قریباً چھ سال نیشاپور میں اس کا قیام رہا ہے۔ اِس بنیاد پر اِس کی تاریخ تعمیر یقیناً ۳۹۵ھ سے پیشتر ثابت ہوتی ہے۔ اور یہ مدرسہ نہ

(بقیہ [illegible])

باب سوم

سلطان محمود بن سبکتگین

محمود کی علمی قابلیت، غزنین کی جامع مسجد مدرسہ اور کتب خانہ محمود کے دربار میں ارباب
کمال کی قدر و منزلت، خوارزم کا خاندان مامونیہ۔ محمود کی علمی فیاضیاں۔

سلاطین آل سبکتگین میں سلطان محمود سب سے زیادہ عالم و فاضل بادشاہ تھا۔ علامہ ابی الوفا قریشی المتوفی ۷۷۵ھ نے اسے ائمۂ فقہا میں شمار کیا ہے۔ اس نے اس زمانہ کے بڑے بڑے اعیان علما، وائمہ فن سے علوم شرعیہ کو تحصیل کیا تھا۔ حدیث فقہ میں اُس نے متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں منجملہ اُن کے ایک کتاب التفرید نہایت مشہور ہے اور فقہ احناف کی کتب مستندہ میں شمار ہوتی ہے۔ اُس میں ساٹھ ہزار مسائل مذکور ہیں[1]۔ محمود کو شعر و سخن سے بھی خاص دلچسپی تھی۔ عربی فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہا کرتا تھا[2]۔

سلطان محمود ۴۱۰ھ میں جب متھرا کی فتح سے واپس آیا تو غزنین میں ایک جامع مسجد سنگ مرمر و رخام سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق) نہ صرف نیشاپور و غزنین کے مدرسوں سے قدیم ہے بلکہ مصر کے مدرسہ سے بھی پانچ سال پہلے تعمیر ہوا ہے۔ مدرسہ مصر اور نظامیہ کی، جو خصوصیات مؤرخین نے بیان کی ہیں۔ وہ بھی اِس میں جمع تھیں۔ یعنی یہ کہ حکومت کی طرف سے اس کا افتتاح ہوا ہے۔ طلبا کو مفت تعلیم دی جاتی۔ اور اُن کے رہنے کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔ ان تمام وجوہات کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ دعویٰ درجۂ ثبوت کو پہونچ جاتا ہے کہ "نصر کا مدرسہ سعیدیہ ہر اعتبار سے اسلامی دنیا کا پہلا مدرسہ ہے"۔

[1] جواہر المضیہ جلد ۲ کشف الظنون

[2] موسیو شیفر (M. Sheifer) نے اپنی کتاب منتخبات فارسی کی جلد دوم صفحہ ۲۰۵ میں جس کا نام کرسٹیمائی دی پرسان ہے محمود نامہ کو سلطان محمود سے منسوب کیا ہے۔ لیکن یہ صریح غلطی ہے محمود نامہ محمود کی تصنیف نہیں ہے۔ بلکہ اُس کو کسی نامعلوم الاسم شاعر نے ساتویں صدی میں یا اُس کے بعد تصنیف کیا ہے اِس میں سات غزلیں ہیں اور اس میں محمود کا عشق ایاز کے ساتھ ظاہر کیا گیا ہے۔ اسی مناسبت سے اِس کو محمود نامہ کہتے ہیں

[3] بیہقی۔ صفحہ ۹۶۷ نمبر ۱۷۶

بنوائی اور اُسے انواع واقسام کے ساز و سامان سے مزین کیا کہ سیاح اُسے دیکھتے تو عروس فلک کہا کرتے تھے۔ مسجد کے پاس ایک عظیم الشان مدرسہ بنوایا۔ اُس میں کتب خانہ بھی قایم کیا جس میں نفیس و نادر کتابیں جمع کیں مدرسے کے اخراجات کے لئے بہت سے دیہات وقف کئے۔ بادشاہ کی تقلید تمام امرانے کی اور اُن لوگوں نے بھی اس قدر مساجد مدارس اور رباطات بنوائے کہ تھوڑی ہی مدت میں غزنین عالیشان عمارات اور علمی درس گاہوں سے معمور ہو گیا۔[۱]

سلطان محمود چوں کہ خود ذی علم اور زبردست عالم تھا اس لئے ارباب فضل وکمال کی خوب قدر و منزلت کرتا تھا۔ قابل آدمیوں کو اطراف عالم سے بلا کر اپنے دربار میں جمع کیا تھا۔ اور سلطنت کے عہدہای جلیلہ اُن کے تفویض کئے تھے۔ بقول مؤرخ فرشتہ کے اِس کے دربار میں ارباب کمال کا اس قدر مجمع تھا کہ ہندوستان میں کسی بادشاہ کے زمانہ میں نہیں ہوا۔[۲] حمد اللہ مستوفی اپنی تاریخ میں لکھتا ہے۔

"آثار او از آفتاب روشن ترست ومساعی او در روزگار دین از شرح و وصف مستغنی۔ کتاب یمینی مقامات ابونصر مشکان ومجلدات ابوالفضل شیبانی شاہد حال اوست علما و شعرا را دوست داشتی و در حق ایشاں عطائے جزیل فرمودی۔ ہر سال زیادت از چہار صد ہزار دینار اول بدیں جماعت صرف شدی۔"[۳]

سلطنت ہائے اسلامیہ میں وزارت کتابت قضایت سفارت بڑے اور جلیل القدر عہدے ہوا کرتے تھے۔ سلطان محمود نے ان خدمتوں پر بڑے بڑے عالم آدمیوں کا معمور کر رکھا تھا۔ احمد حسین میمندی وزارت پر مامور تھا۔ ابونصر مشکان کاتب تھا۔ امام ابو محمد عبداللہ بن حسین الناصحی قاضی القضات تھے۔ امام ابو طیب سہیل بن سلیمان صعلوکی اور امام ابو منصور ثعلبی کو بھی دربار سلطنت سے گہرا تعلق تھا اور دیگر سلاطین کے درباروں میں سفیر مقرر ہو کر جایا کرتے تھے۔

خوارزم کے شاہان مامونیہ[۴] بڑے علم دوست اور ہنر پرور بادشاہ گزرے ہیں ان کے دربار میں حکیم

---

[۱] فرشتہ جلد اصفحہ ۳۰ [۲] فرشتہ جلد اصفحہ ۲۲ [۳] تاریخ گزیدہ صفحہ ۳۹۵ [۴] خوارزم کا خاندان مامونیہ جس کو خوارزم شاہیان قدیم بھی کہتے ہیں ابتدا میں سلاطین سامانیہ کا باج گذار تھا جب سلطنت سامانیہ تباہی کے قریب ہو گئی اور سلاطین آل سبکتگین (باقی صفحہ آیندہ)

طبیب منجم محدث فقیہ شاعر غرض کہ ہر علم و فن کے صاحب کمال جمع تھے سلطان محمود خوارزم کو فتح کر کے ۴۰۸ھ کے موسم بہار میں واپس آیا تو وہاں کے تمام ارباب فضل و کمال کو بھی اپنے ساتھ غزنین میں لایا۔ اُن میں مشہور طبیب اور فیلسوف ابوالخیر خمار ابوریحان البیرونی تھے۔ غزنین میں آنے کے بعد سلطان نے ان لوگوں کی خوب قدردانی کی خصوصاً ابوالخیر خمار کے ساتھ مراعات بغایات سے پیش آیا۔ بیہقی نے ابوالخیر کے حالات میں لکھا ہے "سلطان محمود با او در نہایت اکرام و غایت تجلیل اختیار نمود بحدیکہ گویند زمین را در مقابل او بوسید"

محمود کو فارسی شاعری سے خاص دلچسپی تھی۔ اس کے دربار میں چار سو شاعر تھے۔ عنصری کو ملک الشعرا کا خطاب دے کر اُن کا افسر مقرر کیا تھا۔ اور حکم دے رکھا تھا کہ تمام شعراء دربار میں اپنا کلام سنانے سے پہلے عنصری سے اصلاح لے لیا کریں[۱]۔ ان شعراء میں عنصری۔ عضائری۔ عسجدی۔ ارشدی۔ فرخی۔ فردوسی وغیرہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق) کو نشو و نما ہونے لگا۔ یعنی ۳۸۴ھ اور ۳۹۰ھ کے مابین کچھ عرصہ کے لئے یہ بادشاہ خود مختار ہو گئے۔ لیکن اُن کی یہ خود مختاری زیادہ مدت تک قایم نہیں رہی ۳۹۰ھ میں سلاطین آل سبکتگین نے ان کو اپنے زیر اثر کر لیا۔ یہ امر ابھی تک تحقیق نہیں ہوا ہے کہ اس خاندان کی بنیاد کس زمانہ میں پڑی ہے تاہم ۳۸۰ھ سے ان کا نام تاریخ میں آیا ہے۔ مامون بن محمد خوارزم شاہ ابتدا میں جرجانیہ کا والی تھا۔ ۳۸۵ھ میں ابوعبداللہ والی کات کو شکست دے کر اس کے علاقہ پر متصرف ہو گیا۔ اس فتح سے خوارزم کا تمام علاقہ مامون خوارزم شاہ کے قبضہ میں آگیا (ابن اثیر حوادث ۳۸۵ھ)

۳۸۷ھ میں مامون نے وفات پائی اور اس کی جگہ علی بن مامون بن محمد خوارزم شاہ تخت نشین ہوا۔ اور سلطان محمود کی بہن سے عقد کیا جس کی وجہ سے دونوں بادشاہوں کے درمیان رشتہ اتحاد قایم ہو گیا (ابن اثیر حوادث ۳۸۷ھ) اسی کے زمانہ میں شیخ الرئیس بو علی سینا خوارزم میں آیا تھا۔ اس نے اس کی بدرجہ غایت قدردانی کی تھی۔ (قفطی صفحہ ۴۱۷۔ ابن ابی اصیبعہ جلد ۲ صفحہ ۵)۔

علی بن مامون کے بعد اُس کا چھوٹا بھائی ابوالعباس مامون بن مامون بن محمد خوارزم شاہ برسر حکومت ہوا۔ اور اپنے بھائی کی بیوہ سے جو سلطان محمود کی بہن تھی نکاح کر لیا۔ بڑا علم دوست اور ہنر پرور بادشاہ ہوا ہے۔ ابوالحسین احمد بن محمد سہیلی جو مشہور فقیہ ہے اس کا وزیر اعظم تھا۔ امراء خوارزم نے ۴۰۷ھ میں اسے قتل کر دیا۔ اس وقت اس کی عمر ۳۲ سال کی تھی (ابن اثیر حوادث ۴۰۷ھ) تاریخ بیہقی (۸۴۰)

ابوالعباس مامون بن مامون کے بعد علی بن مامون کا لڑکا ابوالحارث محمد بن علی بن مامون خوارزم شاہ حکمراں ہوا۔ سلطان محمود نے مامون بن مامون کی خوں خواہی کے بہانے سے خوارزم پر یورش کی اور جب یہ ملک فتح ہو گیا تو حاجب کبیر التون تاش کو وہاں کا گورنر مقرر کر کے ۴۰۸ھ کے موسم بہار میں غزنین کو واپس آیا۔ خوارزم میں جس قدر ارباب کمال جمع تھے۔ ان سب کو اپنے ہمراہ غزنین میں لایا (ابن اثیر حوادث ۴۰۸ھ)

خاص امتیاز رکھتے تھے۔ اور دربار کے سبعہ سیارہ کہلاتے تھے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ امیر مسعود بن محمود مہم خراسان سے فارغ ہو کر غزنین میں آیا تو اُس کی تہنیت میں شعراء نے قصائد لکھے۔ محمود نے ہر ایک شاعر کو بیس بیس ہزار درہم اور عنصری و زینبی کو پچاس ہزار دینار عنایت کیے۔

محمود کی فرمایش سے عضائری نے ایاز کی تعریف میں ایک رباعی لکھی جس کے صلہ میں سلطان نے دو ہزار دینار عطا کیے۔ اُس کے بعد غضائری نے ایاز کی تعریف میں ایک غزل پڑھی جو سلطان کو پسند آئی۔ اور صلہ کو المضاعف کر دیا۔ اِس عنایت کے شکریہ میں غضائری نے ایک مطول قصیدہ لکھا جس کے بعض ابیات یہ ہیں ؎

اگر کمال بجاہ اندرست و جاہ بہ مال — مرا ببیں کہ ببینی جمال را بہ کمال
صواب کرد کہ پیدا نکرد ہر دو جہاں — یگانہ ایزدِ دادار بے نظیر و ہمال
وگرنہ ہر دو جہاں را بکف تو بخشیدی — اُمید بندہ نماندی بایزدِ متعال
مرا دو بیت بفرمود شہریارِ جہاں — برآں صنوبر عنبر عذار مشکیں خال
دو بدرہ از بفرستاد ہر ہزار تمام — بزعم حاسد بیمار باد بال ونکال
چہ گفت حاسد ناکس کہ بدسگالِ من ست ق — ز راہ باطن و در آشکار و نیک سگال
دو بدرہ یافتی از نعمت و کرامتِ شاہ — غنی شدی دگر از جور روزگار منال
بلی دو بدرۂ دینار یافتم بہ تمام — حلال و پاک تر از شیرِ دایۂ اطفال
ہزار بود دہزارِ دگر ملک افزود — بیک غزل کہ زمن خواست بر لطیف غزال

جب یہ قصیدہ سلطان کے ملاحظہ میں پیش ہوا تو سلطان نے اُس کے صلہ میں چودہ ہزار درہم پھر عنایت کیے۔ اِس عطیۂ بیکراں کو دیکھکر عنصری نے بے حد پیچ و تاب کھایا اور اِس قصیدہ کے جواب میں ایک قصیدہ لکھا جس کا مطلع یہ ہے ؎

خدایگان خراساں و آفتابِ کمال — کہ وقف کرد برو ذوالجلال عز و جلال

سلطان نے عنصری کو بھی اسی قدر رقم سے سرفراز کی۔[1]

---

[1] غضائری کو جو عطیات ملے ہیں اُن کی تفصیل خزانہ عامرہ میں مذکور ہے۔

ایک دن مجلس عشرت میں سلطان محمود کو بے حد خمار زیادہ ہو گیا اور حالت سرور میں ایاز پر نظر پڑی اُس کے چہرہ پر پیچ در پیچ کاکل بکھری ہوئی تھیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابر میں ماہتاب چمک رہا ہے۔ سلطان کے جوش عشق کو غلبہ ہوا[۱] لیکن زہد و اتقا نے قدم روک دیئے۔ اور ایاز کو حکم دیا کہ زلفیں قطع کر دے۔ اُس نے اسی وقت تعمیل کی صبح جب نشہ فرو ہو گیا اور ایاز کا چہرہ دیکھا تو سخت پشیمان ہوا۔ اور طبیعت اِس درجہ مکدر ہوئی کہ تمام ندما و مقربین یہ کیفیت دیکھکر دم بخود رہ گئے۔ حاجب بزدک علی قریب نے عنصری سے تمام واقعہ بیان کیا۔ عنصری نے سلطان کے سامنے جاکر یہ رباعی پڑھی ؎

کے عیب سر زلف بت از کاستن است | چہ جائے بہ غم نشستن و خواستن است
جائے طرب و نشاط و مے خواستن است | کاراستن سرو ز پیراستن است

یہ اشعار سلطان کو بے حد پسند آئے اور حکم دیا کہ تین بار عنصری کا منہ جواہرات سے بھرا جائے[۲]۔

سنہ ۴۱۳ھ میں سلطان محمود نے قلعہ کالنجر کا محاصرہ کیا تو وہاں کے راجہ نندا نے ۳۰۰ ہاتھی دے کر صلح کر لی۔ اور ہندی زبان میں ایک قصیدۂ مدحیہ لکھکر سلطان کی خدمت میں روانہ کیا۔ دربار ہند اور عرب و عجم کے جو علماء تھے انھیں سلطان نے یہ قصیدہ سُنایا سبھوں نے اُس کی تعریف و توصیف کی تو سلطان نے اِس کے صلہ میں نندا کے تمام علاقے واپس کر دیئے۔ اور علاوہ اِس کے چودہ قلعوں کو اپنی طرف اُسے دیدیا[۳]۔

بابِ چہارم

دربار محمود کے اربابِ فضل و کمال

فضل بن احمد اسفرائینی احمد بن حسن میمندی ابو نصر مشکان۔ ابو نصر عتبی اور اُس کی تاریخ۔ امام ناصحی امام صعلوکی۔ ایلک خاں۔ امام ثعلبی حکیم ابو الخیر خمار۔ حکیم ابو ریحان بیرونی۔

ابو العباس فضل بن احمد اسفرائینی[۴] [۵] ابتدا میں سلاطین سامانیہ کا کاتب تھا۔ امیر ناصر الدین سبکتگین نے اس کو

---

[۱] محمود و ایاز کے اِس قسم کے بے سروپا قصوں کی مولوی محمود شیرانی نے اپنے مضامین میں جو اُردو میں شایع ہوئے ہیں نہایت تحقیق سے تردید کر دی ہے (اڈیٹر)
[۲] چہار مقالہ صفحہ ۴۴ و ۴۵۔ لطایف الطوایف
[۳] فرشتہ صفحہ ۲۱ طبقات اکبری صفحہ ۹
[۴] شرح یمینی صفحہ ۱۵۶ و ۱۶۵ تاریخ گزیدہ صفحہ ۴۸ شاہنامہ صفحہ ۹۰۲ فرشتہ جلد ۱ حبیب السیر

اپنا وزیر بنایا۔ سبکتگین کے بعد محمود نے بھی اپنے ابتدائی زمانہ میں اس کو خدمت وزارت پر بحال رکھا۔ قریباً آٹھ سال اس نے وزارت کی۔ ۳۹۷ھ میں اُس کا انتقال ہوگیا۔ اس کو مورجہانبانی میں خوب لیاقت تھی۔ ایرانی النسل تھا۔ اس لئے ایرانی لٹریچر اور فارسی زبان سے رغبت تمام رکھتا تھا۔ پہلے سلطنت کے احکام و توقیعات عربی میں لکھے جاتے تھے۔ لیکن اُس نے عربی کے بجائے انھیں فارسی میں لکھنے کا حکم دیا۔ فردوسی جب شاہنامہ لے کر طوس سے غزنین میں آیا تو اُس نے دربار میں اُس کی تقریب کی۔ اس کی اولاد سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی تھی۔ لڑکے کا نام حجاج تھا۔ وزیر رشید نے جامع التواریخ میں اُن کی نسبت لکھا ہے کہ :-

"ابوالعباس پسری داشت حجاج نام کہ در فضائل کسب نفسانی سرآمد آں دیار بود و اشعار عربی در غایت بلاغت نظم میفرمود و دختری نیز داشت کہ در علم حدیث مہارت بے نہایت پیدا کرد چنانچہ بعضے از محدثان از دی حدیث روایت کنند۔"

شمس الدین ابوالقاسم احمدؒ بن حسن میمندی[۵] سلطان محمود نے اس کو ابتدا میں خراسان کا دیوان رسائل مقرر کیا تھا۔ فضل بن احمدؒ کی معزولی کے بعد وزارت سے فایض ہوا۔ بلند پایہ اور زبردست عالم ہوا ہے۔ عربی فارسی میں شعر خوب کہا کرتا تھا۔ امام ابوالمنصور ثعلبی نے یتیمۃ الدہر میں اُس کے عربی اشعار نقل کئے ہیں۔ اس نے اٹھارہ سال وزارت کی۔ اس کے بعد سلطان نے اس خدمت سے معزول کر کے قلعہ کالنجر میں قید کرایا۔ تیرہ برس اُس نے قید میں گزارے۔ مسعود کے زمانہ میں رہائی حاصل کی پھر وزارت سے سرفراز ہوا۔ ۴۲۴ھ میں انتقال کیا۔

عام طور پر مشہور ہے کہ احمدؒ کا باپ حسن میمندی سلطان محمود کا وزیر تھا۔ لیکن یہ صریح غلطی ہے۔ حسن میمندی امیر ناصر الدین سبکتگین کے زمانہ میں گذرا ہے۔ امیر سبکتگین نے جب قصبہ بست کو فتح کیا تو وہاں ضبط اموال کے لئے اس کا تقرر ہوا۔ لیکن خیانت کرنے کی وجہ سے امیر نے اُس کو قتل کرا دیا۔ یہ واقعہ سلطان محمود کے تخت نشین ہونے سے پہلے واقع ہوا ہے[۱]۔

---

[۵] شرح یمینی صفحہ ۱۶۶ و ۱۷۲۔ ابن اثیر جلد ۹ صفحہ ۲۸۳ و ۲۹۴۔ عوفی جلد ۱ صفحہ ۶۳ فرشتہ صفحہ ۳۰ [۱] عتبی

ابو نصر بن مشکان[1]۔ مشہور و معروف ادیب ہے۔ اُس نے علم ادب میں المقامات کے نام سے ایک بے نظیر کتاب لکھی ہے۔ مشہور مؤرخ ابو الفضل بیہقی اُس کا شاگرد تھا۔ سلطان مسعود کے زمانہ میں بھی دیوان رسالت کا عہدہ اسی سے وابستہ تھا۔ ۴۳۱ھ میں بزمانہ سلطان مودود اِس کا انتقال ہوا۔

ابو نصر محمد بن عبد الجبار العتبی[2]۔ مشہور ادیب ہے۔ سلطان محمود کے اہل دربار سے تھا۔ سلطان جب بر سرِ حکومت ہوا تو اسے مہم کرجستان پر روانہ کیا۔ اُسی دوران میں کچھ عرصہ کے لئے گنج رستاق میں صاحب البرید ہو گیا پھر غزنین میں آکر دربار میں رہنے لگا۔ ۴۱۱ھ میں اس نے امیر ناصر الدین سبکتگین اور سلطان محمود کی تاریخ لکھی ہے جو یمینی کے نام سے مشہور ہے۔ اور بلحاظ انشاء کے اِس کی عبارت اِس قدر فصیح و بلیغ ہے کہ علمائے ادب اُسے مقامات ہمدانی اور حریری کے ہم پایہ قرار دیتے ہیں۔ احمد المینی المتوفی ۱۰۷۲ھ نے اُس کی شرح لکھی ہے اور اِس میں اُس کے تمام لغات مشکلہ کو حل کیا ہے۔ یہ شرح فتح الوہبی کے نام سے ۱۲۸۶ھ میں بولاق میں چھپ گئی ہے یمینی کو ڈاکٹر اسپرنگر (Springer) نے ۱۸۴۷ء میں دہلی میں چھپوایا ہے۔ اور پروفیسر نولدیکی (Noldeke) نے جرمن میں اس کا ترجمہ کیا ہے۔ جو ۱۸۵۰ء میں بمقام ویانا شایع ہوا ہے۔

آذربائجان کے بادشاہ اتابک ابوبکر محمد بن ایلدگز (۵۸۷ھ تا ۶۰۷ھ ۱۱۹۱ء تا ۱۲۱۰ء) کے زمانہ میں وزیر مہذب الدین ابو القاسم علی بن الحسین کی فرمایش سے ابو الشرف ناصح بن ظفر بن سعد الجرباذقانی نے یمینی کا فارسی میں ترجمہ کیا ہے۔ جرباذقان جسے اہل فارس گل بائیگان کہتے ہیں علاقہ ہمدان میں اصفہان کے قریب واقع ہے۔ عربی کتاب کی بہ نسبت اِس فارسی ترجمہ نے زیادہ شہرت و قبولیت حاصل کی ہے۔ زمانہ مابعد میں ایرانی مؤرخین نے مثل حمد اللہ مستوفی احمد غفاری میرخوند، خوندمیر، فرشتہ، وغیرہ نے اِسی ترجمہ سے امیر سبکتگین اور محمود کے حالات نقل کئے ہیں۔ یہ ترجمہ ۱۲۷۲ھ میں بمقام طہران طبع ہو گیا ہے۔ اِس ترجمہ سے درویش حسن ترکی میں اور جیمس رینالڈ نے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ انگریزی ترجمہ اورنیٹل ٹرانسلیشن فنڈ کے سلسلہ میں ۱۸۵۸ء میں لندن میں چھپا ہے۔

---

[1] ابن اثیر حوادث ۴۳۱ھ صلاح الدین صفوی نے الوافی بالوفیات میں اس کے مفصل حالات لکھے ہیں۔ امام ثعلبی نے تتمہ میں اس کے عربی کلام کو نقل کیا ہے

[2] روضۃ الصفا جلد ۴ صفحہ ۹۴۔ حبیب السیر طبقات ناصری ترجمہ ریورٹی جلد ۱ صفحہ ۸۶ حاجی خلیفہ جلد ۶ صفحہ ۵۱۴۔ ایلیٹ ہسٹری جلد ۲ صفحہ ۱۴ ریو جلد ۱ صفحہ ۱۵۷ رسالہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۸۶۱ء صفحہ ۴۲۴۔

امام ابو محمد عبد اللہ بن حسین الناصحی[1] تفسیر حدیث فقہ کے زبردست عالم اور مذہب حنفیہ کے امام وقت مانے جاتے تھے۔ سلطان محمود اور مسعود کے زمانہ میں مدت مدید تک قاضی القضاۃ کے عہدہ جلیلہ پر مامور رہے ہیں ۴۴۷ھ میں فرخ زاد کے زمانہ میں ان کا انتقال ہوا ہے۔

۴۱۲ھ میں علماء فضلا اور دیگر اہل اسلام کی ایک جماعت کثیر نے سلطان محمود سے عرض کی کہ اعراب اور قرامط کی وجہ سے بیت اللہ کا راستہ مسدود ہو گیا ہے۔ ان کے خوف اور خلفا کے خلف سے سلیمان ایک عرصہ سے حج و زیارت بیت اللہ سے محروم ہیں۔ سلطان نے قاضی صاحب کو امیر حجاج بنا کر غزنین سے حاجیوں کا ایک قافلہ روانہ کیا زاد راہ کے لئے تیس ہزار دینار دیئے۔ یہ قافلہ مناسک حج ادا کرنے کے بعد ایک سال کے اندر خیر و خوبی سے واپس آیا[2]۔

امام ابو طیب سہیل بن سلیمان صعلوکی[3] تفسیر حدیث فقہ ادب کلام میں امام وقت اور نیشاپور کے قاضی القضات تھے۔ ائمہ حدیث نے اُن کو شیخ خراسان اور شمس الاسلام کے لقب سے یاد کیا ہے۔ خراسان کے فقہا اگر کسی مسئلہ میں اختلاف کرتے تو فیصلۂ آخر کے لئے وہ مسئلہ اُن کے یہاں پیش ہوتا تھا۔ اُنھوں نے ۴۰۴ھ میں بمقام نیشاپور وفات پائی ہے ۳۸۹ھ میں ایلک[4] خاں نے جب آل سامان کا خاتمہ کر دیا تو مملکت سامانیہ کے بارے میں ایلک خاں اور سلطان محمود کے مابین یہ قرار پایا کہ ماوراء النہر پر ایلک خاں کا اور خراسان پر محمود کا قبضہ رہے۔ اس تصفیہ کے

---

[1] جواہر المضیہ جلد ۱ صفحہ ۱۷۴ [2] ابن اثیر جلد ۹ صفحہ ۲۲۹۔ فرشتہ جلد ۱ صفحہ ۳۰ [3] مفتاح السعادہ جلد ۲ صفحہ ۱۸۲

[4] ایلک خاں۔ مؤرخین نے ماوراء النہر کے بادشاہ کا نام ایلک خاں لکھا ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ نام شخص خاص کا نہیں بلکہ خاندان کا لقب ہے۔ اس خاندان کے حالات کسی مؤرخ نے مستقل عنوان کے تحت میں نہیں لکھے ہیں۔ ابن اثیر ابن خلدون۔ منہاج سراج۔ وزیر رشید الدین وغیرہ نے اپنی تاریخوں میں مختلف مقامات پر اس خاندان کے حالات دوسرے سلاطین کے تحت میں لکھے ہیں احمد غفاری نے جہاں آراان کے حالات ایک علحدہ باب میں لکھے ہیں۔ لیکن وہ نہایت مختصر ہیں حال میں سر مہنری ہوارٹ نے مؤرخین عرب کی تصنیفات سے اخذ کر کے مضمون اس کے متعلق لکھا ہے جو نہایت مکمل اور معلومات مفیدہ سے مملو ہے۔

مؤرخین ان بادشاہوں کو خوانین ایلک خانیہ کے علاوہ آل افراسیاب بھی کہتے ہیں۔ یہ بتانا غیر ممکن ہے کہ کس زمانہ میں اس خاندان کا ظہور ہوا۔ لیکن چوتھی صدی کے اخیر ایام سے تاریخ میں اُس کا ذکر ملتا ہے اوائل زمانہ میں

(باقی صفحہ آئندہ)

بعد سلطان محمود نے امام صاحب کو سفیر بنا کر ایلک خاں کے پاس روانہ کیا۔ بے شمار تحف و ہدایا کے ساتھ اپنی لڑکی بھی ان کے ہمراہ کر دی۔ تاکہ ایلک خاں کے ساتھ امام صاحب اِس کا عقد کر دیں۔ امام صاحب جب ترکستان میں پہونچے تو ایلک خاں نے ان کی بے حد تعظیم و تکریم کی اور کچھ عرصہ کے بعد امام صاحب فائز المرام ہو کر اور کندسے واپس تشریف لائے۔[1]

امام ابو المنصور عبد الملک محمد بن اسمٰعیل الثعلبی[2] اپنے زمانہ کے سب سے بڑے مصنف اور ادب اور تاریخ میں امام وقت مانے جاتے تھے۔ ۳۵۰ھ میں بمقام نیشاپور پیدا ہوئے۔ اور ۴۲۹ھ میں بمقام غزنین انتقال کیا۔

موسیو زوٹن برگ (M. Zotenburg) نے کتاب الغرر فی اخبار ملوک الفرس کے دیباچہ میں ان کے مفصل حالات لکھے ہیں امام صاحب کی بعض مشہور تصنیفات کے نام یہ ہیں۔ لطائف المعارف، سحر البلاغۃ، فقہ اللغۃ، النہایہ فی الکنایہ، کتاب الغرر، تیمیۃ الدہر۔ وغیرہ امام صاحب کو دربار آل سبکتگین سے خاص تعلق تھا۔ انھوں نے کتاب الغرر امیر نصر بن سبکتگین کی فرمایش پر تصنیف کی ہی۔ تیمیۃ الدہر تتمہ کو سلطان مسعود کے نام پر ڈیڈیکیٹ کیا ہی۔ ۳۹۰ھ میں سلطان محمود کی طرف سے سفیر ہو کر خلافت بغداد میں تشریف لے گئے۔ تاکہ سلطان کے لئے خطاب حاصل کریں۔ امام صاحب نے کامل ایک سال بغداد میں قیام فرما کر اس بارے میں کوشش کی۔ تب خلیفہ نے سلطان کو یمین الدولہ و ولی امیر المومنین کا خطاب دے کر اس کے بموجب احکام منا شیر صادر کئے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق) کاشغر ان کا مستقر تھا۔ آل سامان سے جب ما ورار النہر کو لے لیا تو بخارا کو صدر مقام قرار دیا۔ اُن کی حکومت بلاد ترکستان میں سرحد چین تک پھیلی ہوئی تھی۔ مورخین نے بغرا خاں کو اس خاندان کا پہلا بادشاہ بنایا ہے۔ بقول ابن اثیر اُس کا نام ہارون بن سلیمان اور لقب شہاب الدولہ تھا۔ ۳۸۳ھ میں اُس نے وفات پائی ہے (ابن اثیر حوادث ۳۸۳ھ)

بغرا خاں کے بعد جو بادشاہ تخت نشین ہوا۔ اس کا نام ابن اثیر نے ابو نصر احمد بن علی لکھا ہی۔ لیکن صحیح نام نصر بن علی ہے اور اُس کا بہترین ثبوت اُس کے سکّہ جات ہیں جن پر اِس کا نام (ناصر الحق نصر ایلک) یا نصر بن علی ایلک، نقش ہی اُس نام کے سکے ۳۹۰ھ سے ۴۰۰ھ تک مسلسل دس سال کے دستیاب ہوئے ہیں یہ ہی نصر بن علی سلطان محمود کا معاصر تھا۔ اِسی کے دربار میں امام صعلوکی سفیر ہو کر تشریف لے گئے تھے۔ تمام مورخین کا اتفاق ہے کہ اِس نے ۳۸۳ھ سے ۴۰۳ھ تک قریباً بیس سال حکومت کی ہی۔ لیکن ہوارٹ نے اِس کے خلاف یہ رائے ظاہر کی ہے کہ بادشاہ ۴۰۸ھ تک بقید حیات موجود تھا۔

[1] عتبی طبع دہلی صفحہ ۵۵ ترجمہ صفحہ میر خوند سلاطین غزنویہ صفحہ ۲۴ فرشتہ جلد ا صفحہ ۲۳ [2] ابن خلکان جلد ۲ صفحہ ۹۲ مفتاح السعادۃ جلد ا صفحہ ۲۱۳ و ۲۱۴ و ۱۸۷۔ دولت شاہ صفحہ ۴۳ بر کلمان جلد ا صفحہ ۲۸۴ و ۲۸۶

ابوالخیر حسن بن الخمار[۱] اسلام کے دورِ اولین کا مشہور و معروف حکیم ہے۔ ماہ ربیع الاول ۳۳۱ھ کو بغداد میں پیدا ہوا۔ مامون خوارزم شاہ کا ندیم تھا۔ فتح خوارزم کے بعد سلطان محمود کے ہمراہ غزنین میں آیا۔ منطق فلسفہ اور طب میں اُس نے پندرہ سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں۔ مگر اس وقت ناپید ہیں۔

ابن الخمار کا سنہ وفات تحقیق نہیں ہوا۔ وسنفلڈ (Westinfield) نے تاریخ اطبائے عرب میں لکھا ہے کہ اس نے ۳۸۱ھ میں وفات پائی ہے۔ لیکن یہ صریح غلطی ہے۔ کیوں کہ سلطان محمود نے ۴۰۸ھ میں خوارزم کو فتح کیا۔ اور اس کے بعد اُسے اپنے ہمراہ غزنیں میں لایا۔ یقین ہے کہ ۴۰۸ھ کے بعد بھی ابن الخمار عرصہ تک بقید حیات موجود تھا۔ علاّمہ ابن ندیم ابن الخمار کا معاصر ہے۔ اور اپنے کتاب الفہرست میں دو جگہ اس کا ذکر کیا ہے۔ شہرزوری نے بہ نسبت دیگر تذکرہ نویسیوں کے اس کے حالات کسی قدر تفصیل سے لکھے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے۔

"مرکب از دو کلمہ کہ بہ دو نام است یعنی نام خیر و نقل کردہ بود بسیارے کتب از سریانی بہ عربی حکمت را پیش یحییٰ بن عدی خواندہ بود۔ از مخصوصیات او آں کہ ہرگاہ فقیری او را طلب میداشت پیادہ میرفت و میگفت این رفتن راہ کفارہ در ہائے ملوک و سلاطین فساق میسازم و اگر سلطان میطلبید سوار میرفت در لباس بزرگان و غلامان ترک و اسبہائے بدو وضاعت خود را بہ تواضع با فقرا و بہ تعاظم با بزرگان بجامی آورد۔ جالینوس و جمیع حکما نیز ایں طریق سلوک میداشتند۔

و ابن ابوالخیر در بغداد تولد یافتہ بود۔ مامون پسر محمد خوارزم شاہ او را پیش خوارزم شاہ برد محمود سبکتگین بر خوارزم شاہ مستولی گشت او را بغزنہ آورد۔ روزے سلطان محمود بجہتہ عارضہ او را طلب نمود و اسپی از برائے سواری او فرستاد او سوار بہ بازار کفش فروشان عبور کرد اسپ او رم کرد او را بینداخت و بکشت۔ سلطان محمود او را ناحیہ عطا فرمود کہ آنرا ناحیہ خمار میگفتند و او را منسوب بایں بقعہ دانستہ اند۔

او را تصانیف بسیار است در اقسام علوم حکمت بعضے ازاں مقالہ است در توفیق میان نصاریٰ

---

[۱] ابن ندیم صفحہ ۲۴۵ و ۲۶۵ شہرزوری عربی جلد ۲ صفحہ ، فارسی صفحہ ۱۶۶ قفطی صفحہ ۱۶۴ - ابن ابی اصیبعہ جلد ۱ صفحہ ۳۲۲ و ۲۳۳

[۲] ابن الخمار۔ ابوالخیر حسن بن بابا بن سوار بن بہنام بغدادی۔ بہنام لفظ فارسی است۔

وفلاسفہ و مقالہ است در ظاہر ساختن آرائے حکما در باری تعالےٰ و شرائع و مقالہ است در روز بازگشت و کتابی است در کیفیت خلق انسان داور القراط ثانی میگفتند سزاوار بود بہ این اسم۔

حکیم ابو ریحان محمد بن احمد البیرونی[۱] مشہور و معروف مؤرخ اور ہیئت داں ہے۔ اور ۳ ذی الحجہ ۳۶۳ھ بمقام خوارزم پیدا ہوا۔ اور ۷۷ سال کی عمر میں ۳ رجب ۴۴۰ھ کو غزنین میں فوت ہوا۔ بیرونی منسوب ہے بیرونی خوارزم سے۔ ابو ریحان چوں کہ خاص شہر خوارزم کا باشندہ نہیں تھا بلکہ حوالی خوارزم کا رہنے والا تھا، اس لئے بیرونی کے لقب سے مشہور رہوا۔ امام عبد الکریم سمعانی المتوفی ۵۶۲ھ نے اپنی کتاب الانساب میں جو ابو ریحان کی وفات کے قریباً سو سال بعد تالیف ہوئی ہے۔ لکھا ہے۔ البیرونی بفتح البا الموحدہ وسکون الیا آخر الحروف وضم الراء بعدہا الواو و فی آخرہا نون ہذہ النسبۃ الی خارج خوارزم فان بہا من یکون من خارج البلد ولا یکون من نفسہا یقال لہ فلان بیرونی است ویقال بلغتہم ان بشرک است والمشہور بہذہ النسبۃ ابو ریحان المنجم البیرونی۔

ابو ریحان کی عمر کا ابتدائی حصہ خوارزم میں آل مامون کے دربار میں گزرا ہے۔ اسی دوران میں کچھ عرصہ کے لئے ابو ریحان جرجان کو چلا گیا۔ اور وہاں شمس المعالی ابو قابوس بن وشمگیر کے دربار میں رہا۔ ۳۹۰ھ میں اس کے نام سے آثار الباقیہ تصنیف کی۔ ۴۰۰ھ میں جرجان سے خوارزم میں واپس آیا۔ اور ۴۰۷ھ تک قریباً سات سال ابو العباس مامون بن مامون خوارزم شاہ کے دربار میں بسر کئے۔ سلطان محمود فتح خوارزم کے بعد ۴۰۸ھ کے موسم میں غزنین کو واپس آیا تو اپنے ہمراہ ابو ریحان کو بھی غزنین میں لایا۔ گمان ہوتا ہے کہ غزنین میں آنے کے بعد سلطان محمود کے حملوں میں شریک ہو کر ابو ریحان کئی بار ہندوستان میں آیا۔ اور یہاں کے پنڈتوں سے میل جول پیدا کر کے سنسکرت زبان سیکھی پھر ہندوستان کے علم تاریخ و جغرافیہ ہیئت اور ریاضیات اور دیگر علوم کو حاصل کیا اس کے بعد اپنی مشہور کتاب الہند لکھنی شروع کی جو سلطان محمود کے زمانہ میں اختتام کو پہونچی ہے۔

---

[۱] ایڈورڈ سیخاؤ (Seikhao) نے آثار الباقیہ کے دیباچہ میں ابو ریحان کے حالات لکھے ہیں اور اس کی ترتیب میں ان تمام مضامین سے فائدہ اٹھایا ہے جو گزشتہ صدی سے اخیر ایام تک ابو ریحان کے متعلق مشرق و مغرب میں لکھی گئی ہیں اور اس سے بہتر تذکرہ اب تک نہیں لکھا گیا ہے۔ سطور بالا اسی مضمون سے ماخوذ ہیں تاہم بنظر احتیاط کتب ذیل بھی ہم نے دیکھ لی ہیں۔

ابن ابی اصیبعہ جلد ۲ صفحہ ۲۰ ایلیٹ ہسٹری جلد ۲ صفحہ ۱ بروکلمن جلد ۱ صفحہ ۴۷۵۔ آثار الباقیہ۔ ترجمہ انگریزی دیباچہ

ابوریحان نے مختلف علوم وفنون میں متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں قانون مسعودی سب سے بہترین تصنیف ہے مسلمانوں نے علم ہیئت کے متعلق اس وقت تک جو کچھ لکھا ہے ان سب سے یہ کتاب مکمل اور بہتر تسلیم کی گئی ہے۔ آثار الباقیہ عن قرون الخالیہ میں اقوام قدیمہ کے علم کی تاریخ مذکور ہے۔ کتاب الہند میں ہندوؤں کی تاریخ اور علوم وفنون کے حالات ہیں۔ کتاب التفہیم فی صناعت التنجیم نجوم وہندسہ تحریر ہیں۔ یہ کتاب ابوریحان نے خوارزم کی ایک امیرزادی ریحانہ بنت الحسن کے نام پر تالیف کی ہے اور اس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ علمی قدردانی میں اُس زمانہ کی عورتیں بھی مردوں کے دوش بدوش تھیں۔ بعض دیگر تصنیفات کے نام یہ ہیں کتاب الارشاد فی احکام النجوم۔ کتاب الجماہر فی الزواہر۔ مقالید الہیئت۔ العجائب الطبعیہ وغیرہ۔ علاوہ ان کے سنسکرت کی بیس سے زیادہ کتابوں کا ترجمہ کیا یا خلاصہ لکھا ہے۔

باب پنجم

دربار سلطان محمود کے شعرا

دربار سلطان محمود کے شعرا۔ عنصری۔ عسجدی۔ عضائری۔ فرخی۔ آل محتاج۔ اسدی

منوچہری۔ بہرامی۔ امیر قائینی۔ بدایعی بلخی۔

حکیم ابوالقاسم حسن بن احمد العنصری[1] بلخ کا باشندہ تھا۔ ابوالمظفر امیر نصر بن سبکتگین خراسان کا گورنر تھا عنصری پہلے پہل اس کی خدمت میں آیا اور اس کے توسط سے سلطان محمود کے دربار میں باریاب ہوا سلطان نے اُس کی نہایت قدردانی کی اور ملک الشعرا کا خطاب دے کر دربار کے تمام شعرا کا افسر مقرر کیا۔ اس کے جاہ وجلال اور دولت وثروت کا یہ حال تھا کہ اس کا کھانا سونے چاندی کے برتنوں میں پکتا تھا۔ اور جب مکان سے باہر نکلتا تھا تو چارسو زریں کمر غلام اُس کے ہمراہ رکاب رہا کرتے تھے۔

---

[1] عوفی جلد ۲ صفحہ ۳۰ دولت شاہ صفحہ ۴۴ مجمع الفصحا جلد ا صفحہ ۳۵۵ خزانہ عامرہ صفحہ ۳۷ - مرآۃ الخیال صفحہ ۲۴ آتشکدہ صفحہ ۳۱۹ فرشتہ جلد ا صفحہ ۲۹ برون جلد ۲ صفحہ ۱۲۰

عام طور پر مشہور ہی کہ عنصری کے اشعار تیس ہزار سے زیادہ تھے۔ ١٣٠٢ھ میں طہران میں اس کا ایک دیوان چھپا ہی جس میں قصائد کے علاوہ چند غزلیات اور رباعیات بھی ہیں اور اُس کے اشعار کی مجموعی تعداد تین ہزار ہی عنصری نے غزلیات و قصائد کے علاوہ متعدد مثنویاں بھی لکھی ہیں۔ اسدی طوسی نے اپنے لغات میں ان مثنویوں کے بعض ابیات نقل کئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہی کہ شاد بہر شاہنامہ کی بحر میں ہی ؎

چو سر گشتہ غنچۂ سُرخ گل | جہاں جامہ پوشید ہمرنگ ِ ل

وامق و عذرا بحر ہفت پیکر کی بحر میں ہی ؎

گفت کیں مردمان بیباک اند | ہمہ ہموارہ دزد و چالاک اند

ایک مطول قصیدہ میں عنصری نے سلطان محمود کے فتوحات بیان کئے ہیں۔ دولت شاہ نے لکھا ہی کہ اِس قصیدہ کے اَسّی بیت ہیں۔ لیکن دیوان کے مطبوعہ نسخہ میں کل ساٹھ شعر چھپے ہیں۔

تمام تذکرہ نویسوں نے باتفاق لکھا ہی کہ مسعود کے زمانہ میں ٤٣١ھ (١٠٣٩ء) میں اس کا انتقال ہوا۔ صاحب آتشکدہ نے لکھا ہی کہ سلطان ابراہیم بن مسعود کے زمانہ میں عنصری کا انتقال ہوا۔ لیکن یہ صریح غلطی ہے کیوں کہ عنصری کی وفات کے ٢٠ سال بعد ٤٥١ھ (١٠٥٩ء) میں ابراہیم بن مسعود تخت نشین ہوا ہی۔

ابونصر عبدالعزیز بن منصور العسجدی[1] عوفی نے لکھا ہی کہ مرد کا باشندہ تھا۔ دولت شاہ نے ہرات کو اس کا وطن بتایا ہی۔ دربار سلطان محمود کے مشاہیر شعرا سے ہی۔ سلطان محمود جب سومنات کی مہم سے واپس آیا تو اُس کی تہنیت میں عسجدی نے ایک قصیدہ لکھا ہی جس کا مطلع یہ ہی ؎

تا خورده بین سفر سومنات کرد | کردار خویش را علم معجزات کرد

سلطان مسعود کے زمانہ میں ٤٣٢ھ (١٠٤٠ء) میں اس کا انتقال ہوا۔

ابوزید محمد بن علی الغضائری[2] المروزی۔ ری کا باشندہ ہی۔ ابتدا میں اِسے بہاء الدولہ بویہ ٣٨٨ھ (٩٩٨ء)

---

[1] عوفی جلد ٢ صفحہ ٥٠ دولت شاہ صفحہ ٤٧ فرشتہ جلد ١ صفحہ ٣٩ مرآۃ الخیال صفحہ ٢٤۔ آتشکدہ صفحہ ١٣٦ مجمع الفصحا جلد ١ صفحہ ٣٤٠۔ براون جلد ٢ صفحہ ١٢٣

[2] عوفی جلد ٢ صفحہ ٥٩ دولت شاہ صفحہ ٣٣ خزانہ عامرہ صفحہ ٣٦١ مجالس المومنین صفحہ ٥٠٥ مرآۃ الخیال صفحہ ٢٢ مجمع الفصحا جلد ١ فرشتہ جلد ١ صفحہ ٣٩ براون جلد ٢

۴۰۳ھ/۱۰۱۲ کے دربار سے تعلق تھا۔ اور وہاں سے ہر سال ایک قصیدہ لکھکر سلطان محمود کی خدمت میں بھیجتا جس کے صلہ میں اسے ہزار دینار ملا کرتے تھے۔ بہاؤالدولہ کی وفات کے بعد غزنین میں آیا۔ اور سلطان مسعود کے اوائل عہد میں ۴۲۶ھ/۱۰۳۴ فوت ہوا۔

غضائری کا املاء غین معجمہ سے ہے۔ اس کے معنی ہیں کاشی ساز و کاسہ گر۔ اور یہ منسوب ہے غضائر سے غضائر جمع قیاسی ہے غضارہ کی۔ غضارہ کے معنی ہیں گل چسپیدہ اور وہ ظروف سفالین جن پر کاشی اور چینی سے گل بوٹے بنائے جاتے ہیں غضارہ کہلاتے ہیں۔ صاحب مجمع الفصحا نے غضائری کو بدون یا بعد الالف لکھا ہے یعنی غضاری یہ غلطی ہے۔ حکیم عنصری اپنے ایک قصیدہ میں کہتا ہے ؎

کجا شریف بود چوں غضائری بر تو　　　زطبع باشد چونانکہ از سرخ و سفال

برگ نے تاریخ فرشتہ کے ترجمہ میں اس کا تلفظ عین مہملہ سے ادا کیا ہے (Uzaeeri Razi) جن انگریزی مصنفین نے اس کے حالات برگ کے ترجمہ سے نقل کئے ہیں ان میں بھی یہ غلطی موجود ہے[۱]۔

ابوالحسن علی بن جولوغ الفرخی[۲] سجستان کا باشندہ ہے۔ اس کا باپ جولوغ امیر احمد خلف حاکم سجستان کا غلام تھا۔ فرخی ایک دہقان کے یہاں ملازم تھا۔ اور اس خدمت کے معاوضہ میں اسے سالانہ دوسو کیل غلہ اور سو درہم ملا کرتے تھے۔ اس نے امیر خلف کی ایک کنیز سے نکاح کر لیا۔ جس کی وجہ سے موجودہ معاش غیر کافی ثابت ہوئی۔ اور اس نے دہقان سے تین سو کیل غلہ اور ڈیڑھ سو درہم مانگے۔ لیکن دہقان نے صاف جواب دیدیا کہ اس قدر دینا قدرت سے باہر ہے۔ فرخی مایوس ہو کر سجستان سے نکلا۔ اور قسمت آزمائی کرتا ہوا ابوالمظفر چغانی کے دربار میں آیا۔ اور کچھ عرصہ چغانیاں میں بسر کرنے کے بعد سلطان محمود کے دربار میں باریاب ہوا رفتہ رفتہ ایسے مراتب عالیہ حاصل کر لئے کہ جب باہر نکلتا تو بیس زریں کمر غلام سواری کی جلو میں چلا کرتے تھے۔

فرخی نے صنائع بدائع فارسی میں ایک کتاب ترجمان البلاغۃ لکھی ہے جو اس وقت ناپید ہے۔ لیکن رشید الدین وطواط نے اسے دیکھا تھا۔ اور اپنی کتاب حدائق السحر میں اس کے متعلق لکھتا ہے۔

---

[۱] فرشتہ کا انگریزی ترجمہ جلد ۱ صفحہ ۸۹۔ نرنداناتھ کی کتاب　　[۲] چہار مقالہ صفحہ ۶۴ تا صفحہ ۲۰۵ عوفی جلد ۲ صفحہ ۴۷ دولت شاہ صفحہ ۵۵ فرشتہ جلد ۱ صفحہ ۳۹۔ آتشکدہ صفحہ ۸۶ خزانہ عامرہ صفحہ ۳۶۷ مجمع الفصحا جلد ۱ صفحہ ۴۳۹ بردن جلد ۲ صفحہ ۱۲۴۔

"کتابیست در معرفت بدائع شعر فارسی کہ آں را ترجمان البلاغت خوانند بن بندہ نمود بنگریستم شواہد ایں کتاب را ناخوش دیدم ہمہ از راہ تکلف نظم کردہ و بطریق تعسف فراہم آوردہ و با ایں ہمہ از انواع زلل و خلل خالی نہ بود"

۴۲۹ھ میں بزمانِ سلطان مسعود فرخی نے وفات پائی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ابو المظفر چغانی کے بارے میں اکثر مؤرخین اور تذکرہ نویسوں سے غلطی سرزد ہوئی ہے۔ دولت شاہ نے اِس کا نام اِس طرح لکھا ہے" ابو المظفر نصر بن ناصر الدین حاکم بلخ" مؤرخ فرشتہ اسے سلطان محمود کا برادر زادہ لکھتا ہے۔ میر غلام علی آزاد نے اس کا نام ناصر الدین چغانی بتایا ہے۔ والہ داغستانی اور لطف علی آذر سے بھی اسی طرح کی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں حقیقت یہ ہے کہ ابو المظفر کا نہ تو خاندان سبکتگین سے کوئی تعلق ہے اور نہ وہ بلخ کا والی رہا ہے۔ بلکہ اِس کا سلسلۂ نسب آل محتاج سے ملتا ہے۔ آل محتاج ماوراء النہر کے امیران کبار کا ایک خاندان ہے۔ ملوک سامانیہ اور غزنویہ کے زمانہ میں ان کو خوب عروج حاصل ہو گیا تھا۔ اور چغانیاں کی حکومت اِن کے خاندان میں بطور میراث چلی آتی تھی۔ ادب و تاریخ کے صفحات اُن کے حالات سے لبریز ہیں۔

ابوبکر محمد بن مظفر بن محتاج اس خاندان کا جدِ اعلیٰ ہے۔ ۳۲۱ھ میں امیر نصر بن احمد سامانی نے اسے جمیع عساکر خراسان کا صاحب الجیش بنایا تھا۔ ۳۲۹ھ میں جب اس کا انتقال ہو گیا تو اِس کا لڑکا ابو علی احمد بن محمد کو امیر نصر بن نصر نے اُس کے باپ کی خدمت پر بحال کر دیا۔ مشہور ادیب ابو القاسم اِس کا کاتب تھا۔ ۳۳۳ھ میں کسی وجہ سے نوح بن نصر سامانی نے اسے معزول کر دیا تو اُس نے امیر کے خلاف بغاوت برپا کر دی اور ایک عرصہ تک اپنی موروثی حکومت کے لئے لڑائی جھگڑے کرتا رہا یہاں تک کہ ۳۴۴ھ میں اِس کا انتقال ہُوا۔ اِس کا لڑکا ابو المنصور بن احمد بن محمد ابتدا میں اس کا نائب تھا۔ لیکن ابو علی کی وفات پر امیر نوح نے اِسے باپ کی حکومت عطا کر دی۔ اِس کی وفات پر ابو المظفر طاہر بن الفضل بن محمد بن المظفر جو ابو المنصور کا چچا تھا برسرِ حکومت ہوا۔ طاہر بن فضل بڑا ذی علم اور ہنر پرور امیر تھا۔ شعر خوب کہتا تھا۔ بڑے بڑے شاعر دقیقی اور منجیک ترمذی وغیرہ اس کے دربار سے وابستہ تھے[1]۔ ۳۷۷ھ میں جب اُس کا انتقال ہوا تو ابو علی کے لڑکے فخر الدولہ ابو المظفر احمد بن

---

[1] عوفی جلد ا صفحہ ۲۷ و ۲۹

علی بن محمد کو چغانیاں کی حکومت ملی۔ اسی کے زمانہ میں فرخی چغانیاں میں آیا تھا۔ اِس واقعہ کو نظامی عروضی سمرقندی نے چہار مقالہ میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

فرخی کو جب یہ معلوم ہوا کہ امیر ابوالمظفر بڑا فیاض اور شعرا کا قدردان ہے تو سیستان سے نکل کر چغانیاں میں آیا۔ امیر نے افزایش نسل کے لئے اٹھارہ ہزار گھوڑیاں رکھی تھیں اور موسم بہار میں داغ گاہ میں جا کر اُن کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا۔ امیر اس وقت داغ گاہ میں مقیم تھا۔ فرخی وہیں پہونچا عمید اسعد سے دربار میں پہونچانے کی خواہش کی۔ عمید نے جب اُس کی شکل وصورت اور ظاہری حالت کو دیکھا تو اس کے شاعر ہونے کا اُسے مطلق یقین نہ آیا۔ اور امتحان کے لئے اِس سے ایک قصیدہ داغ گاہ کی تعریف میں لکھوایا جس کا پہلا شعر یہ ہے ؎

چوں پرند نیلگوں بر روی پوشد مرغزار ... پرنیانِ ہفت رنگ اندر سر آرد کوہسار

عمید نے جب قصیدہ سُنا تو حیران ہو گیا اور دوسرے روز اُسے امیر کی خدمت میں پیش کیا۔ فرخی نے تھوڑی دیر کے بعد بآواز حزیں اپنا ایک دوسرا قصیدہ امیر کو سُنایا جس کا مطلع یہ ہے ؎

با کارواں حلہ برفتم ز سیستاں ... با حلۂ تنیدہ ز دل بافتہ ز جاں

امیر سخن شناس تھا۔ قصیدہ کو بے حد پسند کیا۔ اِس کے بعد فرخی نے وہ قصیدہ پڑھا جس میں داغ گاہ کی تعریف تھی۔ امیر کو سخت حیرت ہوئی۔ اور اسی عالم میں فرخی سے کہا کہ داغ گاہ میں ہزار بچھیرے ہیں اِن میں سے جس قدر تم پکڑ لو وہ سب تمہارے ہیں۔ فرخی اُٹھا۔ ایک عرصہ تک سرگرداں پھرتا رہا۔ لیکن اُسے ایک بچھیرے کے پکڑنے میں بھی کامیابی نہ ہوئی۔ دوسرے دن امیر نے فرخی کو بُلایا۔ ایک خاصہ کا گھوڑا تین اونٹ پانچ غلام اور پہننے کے کپڑے انعام عطا کئے اور بچھیروں کا وہ گلہ بھی اُسے دیدیا جن کے پکڑنے کے لئے فرخی ایک عرصہ سرگرداں رہا تھا۔

حکیم[1] ابونصر احمد بن منصور الاسدی[2]۔ اسدی تخلص کے دو شخص گذرے ہیں۔ احمد بن منصور الاسدی اور

---

[1] تا نفحہ حوادث سنہ ۴۲۵ [2] فرشتہ جلد ۲ صفحہ ۳۲ دولت شاہ صفحہ ۳۵۔ آتشکدہ مرآۃ الخیال صفحہ ۲۳ مجالس المومنین صفحہ ۵۰ مجمع الفصحا صفحہ ۱۰۷ براؤن جلد ۲ صفحہ ۵۳۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جلد ۲

علی بن احمد الاسدی - اِن میں پہلا باپ دوسرا بیٹا ہی۔ اِن کے حالات لکھنے میں فارسی تذکرہ نویسوں سے خاص غلطی ہوئی ہی۔ بلا امتیاز دونوں کو شخص واحد سمجھا ہے۔ اور اُن کے حالات باہم غلط ملط کر دیئے ہیں۔

احمد بن منصور الاسدی - اِس کا سلسلہ قدیم شاہانِ ایران سے ملتا ہی۔ طوس کا باشندہ اور فردوسی کا اُستاد تھا۔ نیز فردوسی کی بہن بھی اس سے منسوب تھی۔ مدّت تک سلطان محمود کے دربار میں رہا۔ اور سلطان مسعود کے عہد میں ۴۳۲ھ سے پہلے اِس کا انتقال ہوا ہی۔ اُس نے اپنے قصائد کے ابتدا میں بطور تمہید مناظرات لکھّے ہیں۔ ان کے بعد مدح کی جانب گریز کرتا ہی۔ ان مناظرات کی علمی دنیا میں نہایت شہرت ہی۔ منجملہ ان کے پانچ مناظرون کے متعلق جن کے عنوان یہ ہیں۔ ارض و سما۔ لیل و نہار۔ قوس و رمح۔ عرب و عجم۔ گبر و مسلمان۔ ڈاکٹر ہرمن ایتھی (Ethe) نے ایک عالمانہ مضمون لکھکر نیشنل اورینٹل کانفرنس کی پانچویں اجلاس میں پیش کیا ہی جو ۱۸۸۲ء میں بمقام برلن منعقد ہوا تھا اور اس کی رویداد کے صفحہ ۴۸ میں چھپا ہی۔

علی بن احمد الاسدی کو ابتدا میں ملوک بویہ کے دربار سے تعلق تھا۔ پھر آذربائجان چلا آیا۔ اور ابو دلف کرکری رئیس اران کے مصاحبوں میں شامل ہوگیا۔ اُس کے وزیر کی فرمایش سے شاہنامہ کے جواب میں گرشاسپ نامہ لکھا ہی۔ چنانچہ دیباچہ میں کہتا ہی ؎ (صفحہ ۸)

بمن گفت فردوسی پاک مغز	بداد است داد سخنہائے نغز
بہ شہنامہ گیتی بیاراستہ است	وزاں نام نامِ نکو خواستہ است
تو ہم شہری او را و ہم پیشۂ	چو او در سخن چابک اندیشۂ
ازاں ہمرہاں نامۂ باستاں	بہ نظم آر خرم یکے داستاں

گرشاسپ نامہ ۴۵۸ھ میں اختتام کو پہونچا ہی۔ اور اِس کا ایک نسخہ خود اسدی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ویانا کی امپیریل لائبریری میں محفوظ ہے[1]۔ یہ کتاب نہایت کمیاب اور غیر معروف ہی۔ بعضوں نے اِس کو فردوسی کی تصنیف سمجھکر شاہنامہ میں ملحق کر دیا۔ ٹرنر میکن نے بمقام کلکتہ جو شاہنامہ چھپوایا ہی۔ اُس کی جلد چہارم میں یہ الحاقی حصّہ بطور ضمیمہ موجود ہی۔

لغت فرس علی اسدی فارسی لغت کا سب سے پہلا مدوّن ہی۔ اِس نے اپنی کتاب میں نادر اور غریب الفاظ جمع

---

[1] اس کے متعلق اِس رسالہ کا پہلا مضمون ملاحظہ ہو۔ (اڈیٹر)

کے ہیں۔ اور باالالتزام ہر لفظ کے ساتھ اساتذہ کے اشعار کو بطور شواہد نقل کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۸۹۷ء میں بمقام گوٹنگن چھپی ہے۔

اکثر تذکروں میں لکھا ہے کہ فردوسی[1] جب غزنین سے نکلا تو شاہنامہ ناتمام تھا۔ اور جب اُس کا وقت رحلت قریب آیا تو اس نے اسدی کو بلاکر شاہنامہ کو مکمل کرنے کی خواہش کی۔ پس زیدی نے چار ہزار بیت میں تسلّط عرب بر عجم کے حالات کو بیان کر کے کتاب کو ختم کر دیا۔ حقیقت میں یہ ایک فرضی کہانی ہے۔ کیوں کہ فردوسی تصنیف شاہنامہ کے بعد مدت تک زندہ رہا ہے۔ اِس کے بعد عراق میں جاکر مثنوی یوسف زلیخا لکھی ہے۔ ایسی حالت میں یہ امر بعید از قیاس ہے کہ شاہنامہ کو فردوسی ناتمام رکھتا۔ اور اسدی سے اس کو مکمل کراتا۔

ابوسعید احمد بن محمد المنشوری[2]۔ سمرقند کا باشندہ ہے۔ سلطان محمود کے درباری شعراء میں شامل تھا۔ رشید الدین وطواط نے حدایق السحر میں لکھا ہے کہ اِس نے صنعت تلوّن کو مختصر کیا ہے۔ اور خورشیدی نے اِس کی شرح لکھی ہے جس کا نام کنز الغرائب ہے۔ صنائع لفظیہ میں تلون اس صنعت کو کہتے ہیں کہ ایک شعر دو بحر یا زیادہ میں پڑھا جائے۔

اُستاد ابو الحسن علی البہرامی[3]۔ سرخس کا باشندہ ہے۔ فن عروض و قافیہ میں سرآمد روزگار ہوا ہے۔ عوفی نے اُس کے حالات میں لکھا ہے کہ

> "او را در علم شعر و معرفت آں مہارتے کامل بود خجستہ نامہ کہ در علم عروض بے نظیر ست از مشہورات اوست۔ بہرامی نے شعر فارسی کے متعلق کئی کتابیں لکھی ہیں مثلاً غایت العروضیین کنز القافیہ خجستہ نامہ وغیرہ یہ کتابیں اس وقت ناپید ہیں۔ شمس الدین قیسی نے انھیں دیکھا تھا۔ اور اپنی کتاب المعجم فی معائیر اشعار العجم کی تالیف میں اُن سے استفادہ کیا ہے۔"

بہرامی نے ۵۰۰ھ / ۱۱۰۶ء میں وفات پائی ہے۔ عوفی نے اِس کو محمودی شعراء میں شمار کیا ہے۔ صاحب مجمع الفصحا کا بیان ہے۔ کہ ناصر الدین سبکتگین کا معاصر تھا۔ لیکن یہ صریح غلطی ہے۔ کیوں کہ سبکتگین نے ۳۸۷ھ / ۹۹۷ء میں وفات

---

[1] تذکرہ دولت شاہ [2] چہار مقالہ صفحہ ۳۵ عوفی جلد ۲ صفحہ ۴۴ حدایق السحر ورق ۱۱ مجمع الفصحا جلد ۱ صفحہ ۵۰۶

[3] چہار مقالہ صفحہ ۳۵ و ۸۳ عوفی جلد ۲ صفحہ ۵۵ و ۵۷ لغات اسدی صفحہ ۱۲ مجمع الفصحا جلد ۱ صفحہ ۱۷۳

پائی ہے۔ اور بہرامی اُس کی وفات کے قریباً ایک سو تیرہ سال بعد ۵۰۰ھ ۱۱۰۶ء میں فوت ہوا ہے۔

امیر بزرجمہر ابوالمنصور قسیم بن ابراہیم بن منصور قائینی[۱] سلطان محمود اور مسعود کے زمانہ میں گذرا ہے۔ ذی ثروت اور دولت مند امیر تھا۔ عربی فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہا کرتا تھا۔ فارسی کلام عوفی نے نقل کیا ہے۔ عربی قصاید جو سلطان محمود کی مدح میں ہیں اُن کے بعض انتخاب امام ثعلبی کی کتاب تتمۃ الیتیمہ میں مذکور رہیں۔

محمد بن محمود البدائعی[۲] بلخ کا باشندہ ہے۔ سلطان محمود کی فرمایش سے اُس نے وزن تقارب میں نصیحت نامہ نوشیرواں کو منظوم کیا ہے۔ یہ کتاب اِس وقت کمیاب ہے۔ صاحب مجمع الفصحا نے اِس کے متفرق اشعار نقل کئے ہیں۔

---

۱ چہار مقالہ صفحہ ۳۵ - عوفی جلد ۱ صفحہ ۳۳ - مجمع الفصحا جلد ۱ صفحہ ۶۶   ۲ مجمع الفصحا جلد ۱ صفحہ ۱۷۴

خطباتِ گارساں دتاسی

(مترجمہ جناب سید راس مسعود صاحب بی اے (آکسن) آئی ای ایس ۔ ناظم تعلیمات حیدرآباد (دکن))

(تیسرا[1] خطبہ ۔ بتاریخ ۵ دسمبر ۱۸۵۲ء)

حضرات!

لفظ "ہندوستانی" اُس زبان کے حق میں جس کے لئے یہ استعمال کیا جاتا ہے ناموزوں ہے اور اُسے اس نام سے یاد کرنا ہماری بد مذاقی ہے البتہ اس کو ہندوستانین (Hindustanien) کہا جاسکتا ہے۔ مگر انگریزوں کی تقلید میں ہم نے بھی اس کی ابتدائی شکل قائم رکھی جیساکہ نام سے ظاہر ہے ہندوستانی اہل ہندوستان کی زبان ہے مگر یہ زبان اپنی حقیقی حدود سے باہر بھی بولی جاتی ہے خصوصاً مسلمان اور سپاہی اس کو تمام جزیرہ نما ہندوستان نیز ایران تبت اور آسام میں بھی بولتے ہیں ۔ پس اس زبان کے لئے لفظ "ہندی" یا "انڈین"۔ جو ابتدا میں اس کو دیا گیا تھا اور جس نام سے کہ اکثر باشندے اس ملک کے اب تک اس کو موسوم کرتے ہیں اس نام سے زیادہ موزوں ہے جو اہل یورپ نے اختیار کیا ہے ۔ اہل یورپ لفظ ہندی سے ہندوؤں کی بولی مراد لیتے ہیں جس کے لئے "ہندوی" بہتر ہے اور مسلمانوں کی بولی کے واسطے "ہندوستانی" کا نام قرار دے لیا ہے ۔ خیر یہ جو کچھ بھی ہوا، ہندوستانی اس جدید زبان کی دو بڑی اور خاص شاخیں برٹش انڈیا کے بڑے حصے میں بولی جاتی ہیں اور شمال کے مسلمانوں کی زبان یعنی ہندوستانی اُردو ممالک مغربی وشمالی کی سرکاری زبان قرار دی گئی ہے ۔ اگرچہ ہندی بھی اردو کے ساتھ ساتھ

[1] سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو رسالہ ماہ جنوری ۱۹۲۳ء

اسی طرح قائم ہے جیسے کہ وہ فارسی کے ساتھ تھی - واقعہ یہ ہے کہ مسلمان بادشاہ ہمیشہ ایک ہندی سکرٹری جو ہندی نویس کہلاتا تھا اور ایک فارسی سکرٹری جس کو وہ فارسی نویس کہتے تھے رکھا کرتے تھے تاکہ اُن کے احکام ان دونوں زبانوں میں لکھے جائیں اسی طرح برٹش گورنمنٹ ممالک مغربی وشمالی میں ہندو آبادی کے مفاد کے لئے اکثر اوقات سرکاری قوانین کا اردو کتابوں کے ساتھ ہندی ترجمہ بھی دیو ناگری حروف میں دیتی ہے -

حضرات! میں نے اس سے قبل آپ کے سامنے کئی مرتبہ ہندوستانی علم ادب اور اس کی مختلف شاخوں کی نسبت تقریر کی ہے - آپ کو معلوم ہے کہ اس زبان کی تاریخ کی پہلی جلد میں میں نے ۷۵۰ مصنفوں اور آٹھ سو سے زیادہ کتابوں کا ذکر کیا ہے - اس کی تیسری جلد میں جس کے طبع ہونے میں بعض وجوہ سے تاخیر ہو گئی ہے، میں اس سے دو چند جدید مصنفوں کا اور اسی قدر کتابوں کا احوال لکھوں گا - دیسی سوانح نویس عموماً صرف ان لوگوں کے چند اشعار لکھدینے پر اکتفا کرتے ہیں جن کی سوانح عمری وہ لکھ رہے ہیں اور اُن کی خاص خاص تصانیف اور تالیفات کا ذکر نہیں کرتے -

اس وقت میں ان بیشمار مصنفیں میں سے صرف تین کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں جن کے متعلق میں نے اطلاع بہم پہنچائی ہے - یہ تینوں صاحب دہلی کالج کے پروفیسر ہیں - جہاں کا صدر یعنی پرنسپل بارہ سال سے ایک مشہور فرانسیسی فیلیکس بوترو (M. Felix Boutros) ہے - صدر مذکور "ورنیکولر ٹرانسلیشن سوسائٹی" (یعنی انجمن ترجمہ) کے بانیوں میں سے ہیں - اور اسی انجمن نے سنسکرت فارسی عربی اور انگریزی زبانوں سے ترجمے کر کے ہندوستانی زبان کی بڑی خدمت کی ہے -

مذکورہ بالا اصحاب میں سے پہلے شخص رام چند ہیں جن کے عیسائی مذہب قبول کر لینے پر (اور کہا جاتا ہے کہ دہلی کے یہ پہلے ہندو ہیں جنھوں نے یہ مذہب اختیار کیا) اس سال کے ماہ جولائی میں خاصی ہلچل مچ گئی تھی - اس پنڈت کی عمر اس وقت ۲۵ سال کی ہے - یہ شخص دہلی کالج کا طالب علم تھا - اور اس کالج میں اس نے انگریزی، ہندوستانی اور فارسی زبانوں کو حاصل کیا تھا - لیکن علم ریاضی کی طرف اس کا خاص رجحان تھا - وہ متعدد مفید کتابوں کا مصنف اور مترجم ہے جن میں سے ایک الجبرا ہے جو (Bridge and Bulae) کی

تقلید میں لکھا گیا ہے۔ ایک کتاب علم مثلث پر ہے جس میں مخروطات بھی شامل ہیں - Analytical Trigonometry with conic sections (Hallam &) اور ایک کتاب علم ہندسہ پر ہے جو Bourdonlat کے طریقہ پر مرتب کی گئی ہے۔ ایک کتاب علم الحساب پر لکھی ہے اور ان کے علاوہ کئی کتابیں ادب پر ہیں۔ یہ پروفیسر دو رسالوں کے اڈیٹر بھی ہیں ان میں سے ایک خاص طور قابل ذکر ہے جس کا نام "محبوب ہند" ہے یہ ایک ماہانہ پرچہ ہی جس میں اہم مسائل و معاملاتِ وقت پر دیسیوں کی تعلیمی حالت پر اور مشترکہ ادب یعنی ہندوستانی زبان کی ترقی پر مضامین لکھے جاتے ہیں۔

دوسرے صاحب جن کی طرف میں آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں رام کرشن ہیں یہ زبردست صوفی عالم اور انگریزی ادب میں ایسے ہی قابل ہیں جیسے رام چند۔ یہ کشمیری النسل اور دہلی کے رہنے والے ہیں۔ ان کی عمر قریب چالیس سال ہے۔ انھوں نے بہت سے مضامین انگریزی سے اردو میں ترجمہ کئے ہیں جن کی عبارت نہایت فصیح اور شستہ ہے۔ چند ان میں سے یہ ہیں۔ دی پرنسپلس آف ہندولا (اصول ہندو شاستر) مصنفہ سر ولیم میکناٹن کا ترجمہ۔ یہی وہ صاحب ہیں جو عربی (الف لیلہ) کے اڈیٹر ہیں اور افغانوں اور انگریزوں کی گذشتہ لڑائی میں بمقام کابل مقتول ہوئے۔ ترجمۂ اصول حکومت (دی پرنسپلس آف گورنمنٹ) کے علاوہ بھی قانون پر اُن کی کئی تالیفات ہیں۔ نیز دوسرے فنون میں بھی چند کتابیں لکھی ہیں مثلاً فن زراعت پر طب پر اور ایک انگریزی گرامر ہندوستانی زبان میں جس کے لکھنے میں انھیں ڈاکٹر اسپرنگر (Springer) نے بھی مدد دی ہے ڈاکٹر اسپرنگر اُس وقت دہلی کالج کے پرنسپل تھے۔ آج کل فورٹ ولیم کالج میں ممتحن اور ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے سکرٹری ہیں۔ اُن میں سے تیسرے صاحب کریم الدین ہیں۔ یہ پانی پت کے رہنے والے اور جیسا کہ اُن کے نام سے ظاہر ہے مسلمان ہیں تقریباً ۱۸۱۲ء میں دہلی کالج میں شریک ہوئے اس وقت اُن کی عمر ۵۹ سال کی ہے اُن کی تمام تالیفات نثر میں ہیں اُن کو اس بات پر فخر ہے کہ انھوں نے کبھی کوئی نظم نہیں لکھی۔ انھوں نے بہت بُرا بھلا کہا ہے کہ لوگوں نے ہندوستان میں شاعری کو پیشہ بنا لیا ہے۔ اُن کی کتابوں میں بعض جدید تصانیف ہیں بعض ترجمے اور بعض تالیفات۔ پہلی صنف میں حسب ذیل کتابیں ہیں: ایک کتاب عورتوں کی تعلیم پر جس کے متعلق ہندوستان میں بہت غفلت کی جاتی ہے۔ ایک سوانح عمری ایشیا اور افریقہ کی مشہور

عورتوں کی۔ اور ایک کتاب عروض پر جو بہت مشہور ہوئی۔ دوسری صنف میں یہ کتابیں ہیں ابوالفدا کی تاریخ کا ترجمہ۔ ہندوستانی شاعروں کا تذکرہ اور عرب کے شاعروں کی تاریخ۔ تیسری صنف میں یہ کتابیں، ہندوستانی (اردو) کے اساتذہ کے کلام کا انتخاب۔ ایک کتاب وراثت پر جو اسلامی شریعت میں نہایت پیچیدہ مسئلہ ہے۔ علوم عملی (Exact sciences) پر ایک مختصر رسالہ اور دلچسپ مقولوں اور لطیفوں کی ایک کتاب جس کا نام "باغ ہند" ہے۔

سنہ ۱۸۵۰ء کی طرح سنہ ۱۸۵۱ء میں بھی ہندوستانی مطابع ممالک مغربی و شمالی میں برابر کام کرتے رہے۔ اس زمانہ میں ہندی اور اردو رسالے اور بہت سی کتابیں شائع ہوئیں۔ اس سال پھر میرے پاس بعض دوستوں کی عنایت سے نئے مطبوعات کی فہرست پہنچ گئی ہے۔

حضرات! میں آپ کے سامنے ابتدائی رسالوں یا جو قدیم اساتذہ کی تصانیف یا مسلمانوں کی مذہبی کتابوں کا جو دوبارہ یا بار بار چھپتی رہتی ہیں، ذکر نہ کرونگا۔ اگرچہ اسلامی مذہبی کتب میں سے قرآن شریف معہ اُردو ترجمہ کے ایک دہلی کا اور دوسرا آگرہ کا قابل لحاظ ہے۔ لیکن مذکورہ ذیل کتابیں خاص طور پر قابل بیان ہیں۔ "تاریخ آگرہ" جو محمد سدید الدین نے اُردو میں لکھی ہے۔ "بہارِ عشق" مولفہ نور علی یہ کتاب نل کا قصہ معلوم ہوتی ہے۔ "قصہ گرد چیلا" یہ قصہ کلیلہ دمنہ کے قصہ کے طرز پر لکھا گیا ہے۔ "قصہ سپاہی زادہ" دیوان نوید" ایک مشہور ہمعصر شاعر کا دیوان۔ "دیوان نظیر" جو اب تک کامل نہیں چھپا تھا۔ گلستاں کا ہندوستانی ترجمہ جو پہلی مرتبہ فارسی متن کے ساتھ طبع ہوا ہے۔ ایک تاریخی نظم فاتحانِ ہندوستان پر معہ انگریزی ترجمہ کے یہ کتاب شہنشاہِ دہلی کے حکم سے شاہی شاعر مہاراجہ اپروا کرشن بہادر نے لکھی تھی۔ یہ شاعر اگرچہ ہندو تھا۔ مگر بجائے ہندی میں لکھنے کے جو عام طور پر ہندوؤں کی زبان ہے۔ اُس نے اردو میں لکھی۔ آخر میں ایک قصہ قابل بیان ہے۔ جو علم الاقوام کے نقطۂ نظر سے موجب دلچسپی ہے اور ٹھیٹ ہندوستانی میں عربی اور فارسی الفاظ کی آمیزش کے بغیر لکھا گیا ہے۔ اس کے لکھنے والے انشاء اللہ خاں تھے جو اسی صدی کے ابتدا میں ایک مشہور شاعر گذرے ہیں یہ قصہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے ایک رسالہ میں طبع ہوا ہے۔

ہندی کی صرف اِن کتابوں کے بیان کرنے پر اکتفا کروں گا۔ اخلاقی مقولے موسوم بہ "نیتی بنود" ہندو مہاجنوں کے لئے ایک کتاب جس کا نام "مہاجنی سروپکا" ہے ہندی مطبوعات میں جن کی اشاعت کی اس سال اطلاع دی گئی ہے، وید کے کامل ترجمے خاص طور پر قابل بیان ہیں جس کے ساتھ اصل سنسکرت بھی ہوگی

حضرات! مجھے اُمید ہے کہ میرے لکچر ہندوستان کی جدید زبان کے علمی اور ادبی مطبوعات کے پڑھنے میں کافی طور پر رہنمائی کریں گے۔ میری تعلیم کا طریقہ جو میں نے اختیار کیا ہے، وہ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے تفصیلی ہے۔ میں ہر لفظ کی تشریح کرتا ہوں اور متن کے معنی و مطالب کے ساتھ ساتھ نحوی قواعد پر بھی نظر ڈالتا جاتا ہوں اور ہر محاورے کا تجزیہ کرتا ہوں۔ میری دانست میں یہی ایک طریقہ اصلی اور صحیح ترقی کرنے کا ہے۔

ہم اس سال شیر شاہ کی تاریخ کے اُس حصّہ کو ختم کریں گے جو گزشتہ سال ختم کیا گیا تھا۔ شیر شاہ افغانوں کا کیخسرو ( ) تھا جو اگرچہ ابتدا میں ایک گورنر تھا مگر اپنی قابلیت، اپنے کیرکٹر اور اپنے انصاف و عدل کی وجہ سے تخت دہلی پر قابض ہوگیا۔ ابھی وہ بہت کم عمر تھا کہ اُس کے والد نے اُسے اپنے علاقہ کے ایک حصّہ کا انتظام سپرد کیا۔ والد سے رخصت ہوتے وقت اُس نے یہ الفاظ کہے "ابا جان! مجھے اجازت دیجئے کہ میں جناب سے اپنے دلی خیالات کا صاف صاف اظہار کروں۔ میری خواہش ہے کہ میں اس ملک کی زراعت کی ترقی میں کوشش کروں جس کو آپ نے میرے سپرد کیا ہے اور اس کی فلاح و بہبودی میں کوشاں رہوں۔ مگر میں اپنے مقصد میں اُس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں ہر معاملہ میں عدل و انصاف سے کام نہ لوں۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ عدل اعلیٰ ترین نیکی ہے اس سے سلطنتوں کی وسعت اور استحکام ہے۔ اور اسی سے خزانہ مالا مال اور شہر اور قصبے آباد و خوش حال ہوتے ہیں۔ ظلم اس کے برعکس ہے اور بد ترین عیوب میں سے ہے یہ تباہی و بربادی کا موجب ہوتا ہے اور جو اس کا مرتکب ہوتا ہے وہ دنیا و عاقبت میں ذلیل و رسوا ہوتا ہے۔ پس ہر بادشاہ کا فرض ہے کہ اپنی رعایا سے مہربانی سے پیش آئے اور اُن کی خبر گیری کرے کیونکہ خدا نے رعایا کو بادشاہوں کی پناہ میں دیا ہے جن کا فرض ہے کہ اُن کو ظلم و استبداد سے بچائیں اور اُن کو خوش رکھیں۔ اس کے حصول کے لئے کامل عدل و اعلیٰ انتظام ضروری ہے۔ عمدہ حکومت کے نہ ہونے سے بہت سی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور رعایا کے حقوق تلف ہوتے ہیں۔ اچھی حکومت کی مثال اُس بارش کی سی ہے

جو زندگی بخشتی ہے اور بغاوت کے گرد وغبار کو دبا دیتی ہے اور وہ اس تلوار کی مانند ہے جس کے جوہر کا عکس سلطنت کے رخسار پر پڑتا ہے اور اُس کو مثل آفتاب کے منور کر دیتا ہی۔

میں اس امر سے ناواقف نہیں ہوں کہ بعض عہدہ دار جو میرے ماتحت کام کے لئے تجویز کئے گئے ہیں ظلم اور سختی کو جائز رکھتے ہیں۔ میں سب سے اوّل اُن کو نرمی سے متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ اگر وہ میرے کہنے پر عمل کریں گے تو مجھے سختی نہیں کرنی پڑے گی لیکن اگر کچھ ایسے ہوں گے جن میں یہ خرابی اس درجہ سرایت کئے ہوئے ہے کہ وہ اُن سے نہیں چھوٹ سکتی تو میں سختی میں کوتاہی نہ کروں گا اور اُن کو ایسی سزا دوں گا جو دوسروں کے لئے باعث عبرت ہو گی۔ جب بدنظمی پھیلانے والے بدطینت لوگ سلطنت کی آگ کو شعلہ زن دیکھتے ہیں تو چھپے رہتے ہیں۔ برخلاف اس کے جب اُنھیں ذراسی بھی بدنظمی انتظام مملکت میں نظر آتی ہے تو ہر جگہ فساد پیدا کرتے ہیں اور حکومت کی عمارت بہت جلد شکستہ ہو جاتی ہے۔ حکیموں نے کہا ہے کہ مملکت مانند ایک درخت کے ہے جس کی جڑوں کی آبیاری ہمیشہ اچھے نظم و نسق سے کرنی چاہئے تاکہ وہ امن و امان اور اطمینان کے ثمر سے بار آور ہو۔ ...."

حضرات! میں اس سال پریم ساگر کی بھی تشریح کروں گا۔ پریم ساگر ایک کہانی ہے جو مسجع اور مقفیٰ عبارت میں لکھی گئی ہے اور جگہ جگہ اس میں نظم بھی آتی ہے۔ یہ کہانی کرشن جی کے حالات سے متعلق ہے اور بھاگوت کے دسویں باب سے ماخوذ ہے۔ اسی "پران" کے ترجمہ کے طبع کا کام ایک مشہور ہندی کے عالم نے اپنے ہاتھ میں لیا تھا۔ وہ اسی دسویں باب تک پہونچا تھا کہ موت نے علم و ادب کے اس سرمایۂ ناز کو ہم سے چھین لیا۔ لیکن ایک اور کتاب جو ہندی نظم میں ہے اور اسی دسویں باب کے تتبع میں لکھی گئی ہے اور پریم ساگر سے بھی قدیم ہے۔ فرانسیسی زبان سے حال میں (M. H. Pavie) موسیو تھامس بے دی نے طبع کرائی ہے۔ مجھے اس بات کا فخر ہے کہ موسیو موصوف میرے شاگردوں میں ہیں۔ اس کا نام "کرشن جی اور اُن کی تعلیم" ہے۔ اسے یوجین بورنوف کی کتاب کا تتمہ سمجھنا چاہئے۔

پریم ساگر ایک نہایت دلچسپ افسانہ ہے جو معلوم ہوتا ہے کہ عیسیٰؑ کی مقدس تاریخ سے لیا گیا ہے۔ اس کے ہر صفحہ میں عیسائی مذہب کے واقعات کا مبہم سا اعادہ نظر آتا ہے لیکن اتنا فرق ہے کہ وہ سچ ہے اور یہ غلط۔

اور اسی لئے یہ کتاب متشابہات اور اضداد سے بھری ہوئی ہے۔ کرشن جی کی تاریخ اگرچہ مشرقی تخیل کے عجائبات سے پُر ہے اور غیر مسیحی اخلاقی خرابیوں نے اُسے خراب کردیا ہے۔ تاہم عیسیٰ مسیح کی تاریخ سے بہت مشابہت رکھتی ہے۔ یہ وہ بات ہے جسے میں نے اپنی ایک تصنیف میں نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے اور اگرچہ میرا یہ خیال عیسائی ہونے کی بنا پر تھا مگر میں نے دیکھا کہ یہ مقابلہ مذہبی احساسات کو صدمہ پہونچانے کے بجائے کتاب کی وقعت کو اور بڑھا دے گا۔ مجھے یہ بات بہت دلچسپ معلوم ہوئی کہ کرشن جی کی زندگی کے حالات عیسیٰ مسیح کے حالات کی صدائے بازگشت ہیں اور اس کی تعلیم عیسائی مذہب کے اصول کا ایک عکس ہے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عیسائی مذہب ہندوستان میں بہت پہلے پھیل چکا تھا جیسا کہ ہماری مذہبی روایتوں سے بھی ظاہر ہے۔ سینٹ فرانسیس زیویر جو پیرس یونیورسٹی کا مشہور طالب علم تھا اور "انڈیز کے مبشر" کے لقب سے مشہور رہے، جب کوچین اور ٹراونکور کے ساحلی قصبوں میں مذہب عیسائیت کی تبلیغ کے لئے پہونچا تو اُس نے وہاں کے اصلی باشندوں کو عیسائی مذہب کا پیرو پایا۔ جن کو اس زمانہ کے وقائع نویسوں نے "پروا" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اُسی نے مقام میلا پور میں سینٹ تھامس کی قبر بھی دیکھی۔ یہاں میں اس بات کا اشارہ بھی کرنا چاہتا ہوں کہ صوبہ بیجاپور میں جس کے بڑے شہروں میں گوا بھی ہے سینٹ مذکور کو ہندوستان کی دکنی بولی میں وعظ کرنا پڑا ہوگا۔ یہ بولی بیجاپور میں اسی طرح مروج ہے جس طرح مرہٹی۔

(چوتھا خطبہ ۔بتاریخ ۲۹ر نومبر ۱۸۵۳ء)

حضرات! ہندوستانی زبان، جیسا کہ آسانی سے معلوم ہوسکتا ہے، صرف بول چال ہی میں استعمال نہیں ہوتی بلکہ اس ملک میں روز بروز تحریر کے کام میں بھی ترقی کرتی جاتی ہے جسے ہم انڈیا (ہندوستان) کہتے ہیں جو وسعت میں اسی قدر بڑا ہے جس قدر براعظم یورپ۔ اسی طرح اس کا علم ادب ترقی کر رہا ہے اور اچھی اچھی تالیفات و تصنیفات سے مالامال ہو رہا ہے۔

۱۸۵۱ء سے نئے سنگی مطبع قائم ہوئے ہیں جہاں سے دلچسپ کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ نئے رسالے

اور اخبار بھی جاری ہوئے ہیں اور پرانے تقریباً سب کے سب زندہ ہیں۔

اس اطلاع کی بنا پر جو میرے دوستوں اور ایک انگریزی اخبار (فرینڈ آف انڈیا) نے اپنی عنایت سے مجھے بہم پہنچائی ہے میں ممالک مغربی و شمالی کے ان مطابع کے متعلق صحیح تفصیل آپ کے سامنے بیان کر سکتا ہوں جو ۱۸۵۲ء کے آغاز میں وہاں جاری تھے۔ ممالک مغربی و شمالی رقبے میں فرانس سے دو چند ہیں اور وہاں کی زبان ہندوستانی ہے، خواہ اردو ہو یا ہندی۔ افسوس ہے کہ میں آپ کو راجپوتانہ، دکن، اودھ اور انگریزی احاطوں کے تینوں دارالحکومتوں کے متعلق کوئی نئی بات نہیں بتا سکتا۔ تاہم جو جزوی تفصیل میں آپ کے سامنے پیش کروں گا اس سے آپ اس ادبی تحریک کا اندازہ کر سکیں گے جو اس زبان کے ذریعہ سے جس کے حاصل کرنے کے لئے آپ یہاں آئے ہیں، ہندوستان میں حقیقی طور پر ظاہر ہو رہی ہے نیز آپ بھی قیاس کر سکینگے کہ زمانہ دراز سے اس نے ایک حیثیت اور اہمیت حاصل کر لی ہے۔

۱۸۵۲ء کے آغاز میں ممالک مغربی و شمالی کے پندرہ شہروں میں ۳۴ سنگی مطبع تھے جن میں ہندوستانی مطبوعات شائع ہوتی تھیں اور ۱۳ ہندوستانی رسالے اور اخبار تھے مطبعوں کی تفصیل یہ ہے۔ (۷) آگرہ میں (۹) دہلی میں (۲) میرٹھ میں (۲) لاہور میں (۷) بنارس میں اور ایک ایک سردھنے۔ بریلی۔ کانپور۔ مرزا پور اندور۔ لدھیانہ۔ بھرت پور۔ امرتسر اور ملتان میں۔

ان مطبعوں سے مفصلہ ذیل ہندوستانی اخبار شائع ہوتے ہیں:۔ آگرہ سے "مطبع الاخبار" جو شہر آگرہ میں خوب بکتا ہے "اخبار الحقائق" جو ہفتہ میں دو بار شائع ہوتا ہے اور "اسد (اسعد) الاخبار" جو ہفتہ میں ایک بار نکلتا ہے۔ ایک اور اخبار اسی شہر سے نکلتا ہے جس کا نام "قطب الاخبار" ہے جس میں مذہب اسلام کے کے متعلق بحث ہوتی ہے اس میں اخبار (احادیث) اسلام۔ انبیار۔ شہدا اور اولیائے اسلام کے حالات شائع ہوتے ہیں اور قدیم مصنفیں کی کتابوں میں سے اقتباسات بھی درج کئے جاتے ہیں۔ "معیار الشعرا" ایک ادبی رسالہ ہے جس میں قدیم و جدید شعرا کا کلام درج ہوتا ہے۔

"اخبار النواح" (؟) پہلے ایک علمی پرچہ تھا۔ مگر اب معمولی خبروں کا اخبار ہے۔ "آگرہ گورنمنٹ گزٹ" کا ذکر بھی مناسب خیال کرتا ہوں۔ یہ سرکاری اخبار ہے اور ہندوستانی اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع

ہوتا ہے - اب اگر ہم دلی کی طرف رجوع کریں تو وہاں "سراج الاخبار" جو اس شہر کا سب سے پرانا اخبار ہے "دہلی اردو اخبار" اردو میں چھپتا ہے - "مظہر الحق" کے اڈیٹر ایک صاحب محمد علی ہیں جن کی اسی نام کی ایک تالیف ہے جس میں مذہب اسلام کی مختلف رسموں کا ذکر ہے۔ "قران السعدین" ایک باتصویر اخبار ہے جس میں سائنس، ادب اور سیاست سے بحث ہوتی ہے اس کے چند نمبر جو میرے پاس آئے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ باتصویر رسالہ ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ اپنے ہم وطنوں میں مغربی معلومات کو شایع کرے۔ اس میں خبریں بھی چھپتی ہیں - ہفتہ میں ایک بار پیر کے روز شائع ہوتا ہے اور ایک ماہانہ رسالہ بھی جس کا نام "فوائد الناظرین" ہے - اس میں علاوہ خبروں کے مضامین بھی چھپتے ہیں جو انگریزی ذرائع سے ماخوذ ہوتے ہیں۔ "دقیق الاخبار" ہندؤں کا ہے۔

میرٹھ میں دو ہندوستانی اخبار ہیں۔ ایک "مفتاح الاخبار" جس کے اڈیٹر محبوب علی ہیں۔ انھوں نے "ہندوستانی لغت اللغات" کا خلاصہ بھی لکھا ہے جو لکھنؤ میں ۱۸۴۳ء میں طبع ہوا دوسرا "جام جہاں نما" ہے یہ جمشید کے اُس پیالے کی طرف اشارہ ہے جس کی تہ میں وہ دنیا کے تمام واقعات جو گزرتے تھے معلوم کرلیتا تھا۔ اس اخبار میں علاوہ معمولی خبروں کے سرکاری گزٹ اور ممالک مغربی وشمالی کی عدالت عالیہ (سوپریم کورٹ) کے فیصلوں کے اقتباسات بھی درج ہوتے ہیں اس کے ساتھ ایک ورق بطور ضمیمہ کے شایع ہوتا ہے جس میں فیضی کی مہابھارت کا فارسی ترجمہ شایع ہوتا ہے یہ ضمیمہ اخبار کے خریداروں کو مفت نذر کیا جاتا ہے

بنارس میں چھ ہندوستانی اخبار ہیں۔ ان میں سے دو اخباروں کا ایک ہی اڈیٹر ہے - ایک ہندی یعنی دیوناگری حروف میں دوسرا اردو یعنی فارسی حروف میں شایع ہوتا ہے - پہلے کا نام "بنارس اخبار" ہے - سُنا ہے کہ راجہ نیپال سے امداد ملتی ہے جن کی رانی بنارس میں ہے - بہرحال اڈیٹر جو ایک پرجوش ہندو ہے ان دونوں اخباروں میں وہ عیسائی مشنریوں کے خلاف ہندو مذہب کی پرزور حمایت کرتا ہے - بنارس کا تیسرا ہندوستانی اخبار "سدھاکر اخبار" ہے یہ اخبار جو انگریزی حکومت کو اچھا سمجھتا ہے پہلے ہندی اردو دونوں زبانوں میں نکلتا تھا مگر اب صرف ہندی میں شایع ہوتا ہے اس کی ہندی دقیق اور سنسکرت کے الفاظ سے بھری ہوتی ہے - اس کی اشاعت صرف تعلیم یافتہ ہندؤں تک محدود ہے - چوتھا اخبار "باغ و بہار" ہے جس کا نام اسی نام کی مشہور کتاب پر

رکھا گیا ہے۔ یہ مہاراجہ بنارس کی سرپرستی میں نکلتا ہے۔ مہاراجہ جدید ادب کے بڑے مربی ہیں اور بہت سی کتابیں انھوں نے اپنے خرچ سے چھپوائی ہیں اور خود بھی ہندوستانی اور فارسی کے شاعر ہیں۔ پانچواں اخبار "سائرین ہند" (؟) ہے یہ دو ہفتے میں ایک بار چھوٹی تقطیع کے آٹھ صفحوں پر چھپتا ہے اور ہر صفحہ میں دو کالم ہوتے ہیں علاوہ معمولی خبروں کے جو کسی قدر تفصیل سے لکھی جاتی ہیں اس میں مختلف قسم کے مضامین ہوتے ہیں۔ چھٹا اخبار "بنارس ہرکارا" ہے جو ۱۸۵۵ء سے اب تک نکل رہا ہے۔

بریلی سے "عمدۃ الاخبار" شایع ہوتا ہے اس کے اوڈیٹر لکشمن پرشاد ہیں۔ اُنھوں نے چھوٹی سی علمی اور اخلاقی سائکلوپیڈیا بھی لکھی ہے اور اس کا نام مشرقی طرز پر "دماغی تفریح" (؟) رکھا ہے۔

مرزا پور سے "خیر خواہ ہند" نکلتا ہے یہ امریکی پروٹسٹنٹ مشنریوں کا اخبار ہے اور اس کا مقصد تبلیغ مذہب ہے۔

"شملہ اخبار" شملہ سے شائع ہوتا ہے یہ بہت اچھا اخبار ہے جسے آج کل شیخ عبداللہ مرتب کرتے ہیں یہ انگریزی ہندوستانی دونوں سے واقف ہیں۔ ہندوستانی ان کی مادری زبان ہے۔

اندور کا اخبار۔ جو مالوہ کا دارالحکومت ہے "مالوہ اخبار" ہے۔ یہ آٹھ صفحوں کا ہفتہ واری ہے۔ اس کے ایک کالم میں اردو اور دوسرے میں ہندی ہوتی ہے اس کے اوڈیٹر دھرم نراین ہیں جن کی عمر صرف چھبیس ستائیس سال کی ہوگی۔ یہ بہت اچھے شاعر ہیں اور انھوں نے مِل کی پولیٹکل اکانمی (معاشیات) اور انگلستان کی ایک تاریخ کا ترجمہ بھی کیا ہے۔

بھرتپور صوبہ آگرہ میں ہے۔ وہاں کا اخبار "مظہر السرور" ہے جو راجہ بھرتپور کی سرپرستی میں شایع ہوتا ہے۔ "مالوہ اخبار" کی طرح اس کے ایک کالم میں اردو اور دوسرے میں ہندی ہوتی ہے۔

اب ہم پنجاب کے اخباروں پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ ان کے ناموں کے دیکھنے سے یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ روشنی علم کی اشاعت میں زیادہ کوشاں ہیں۔ کیونکہ وہاں کے اخبارات کے ناموں کے ساتھ اکثر نور کا لفظ لگا رہتا ہے مثلاً "دریائے نور" جو لاہور کا اخبار ہے۔ ایک دوسرا جو ہفتے میں دوبار شائع ہوتا ہے "کوہ نور" ہے۔ اُس مشہور ہیرے کا نام ہے جو آج کل ملکۂ انگلستان کے قبضہ میں ہے۔

لدھیانہ کا اخبار "نورؒ علی نور" ہے جسے محمد حسین نے ۱۸۵۱ء میں جاری کیا تھا - یہ اپنی ایک نظم کی وجہ سے مشہور ہیں جس میں اُنھوں نے فطرت کی اُن پیداواروں کو منظوم کیا ہے جن کا ذکر احادیث میں آیا ہے امرتسر سے " باغ نور" اور ملتان سے جو اسی نام کے صوبہ کا دارالحکومت ہے " ریاض نور " نکلتا ہے -

حضرات ! اب میں ہندوستانی تالیف و تصنیف کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں جو ممالک مغربی و شمالی میں ۱۸۵۱ء میں شایع ہوئیں - میں اس معلومات میں جو میں نے گزشتہ سال آپ کے سامنے پیش کی کچھ اضافہ کرنا چاہتا ہوں -

رومن کیتھلک نقطۂ نظر سے سردہنہ ان صوبجات میں ایسا ہے جیسے صحرا میں نخلستان - یہاں رومن کیتھلک مشنریوں نے مطبع قائم کر رکھا ہے جس میں حال میں علاوہ اور چیزوں کی مذہبی عقاید کی سوال و جواب کی کتاب بھی چھپی ہے - آگرہ والی کتاب سے زیادہ تفصیلی ہے - کئی کتابیں دعاؤں کی اور فلیوری کے تاریخی سوال وجواب کا ترجمہ ، عیسائی اولیا کے تذکرے اور کئی اور مذہبی کتابیں فارسی اور دیوناگری حروف میں چھپی ہیں -

پراٹسٹنٹوں کی مذہبی مطبوعات بلاشبہ بہت زیادہ ہیں اور اُن کی اشاعت سے اہل ہند میں رفتہ رفتہ عیسائی خیالات کی اشاعت ہوتی جاتی ہے اور اُسی کے ساتھ ابتدائی کتابیں جو انگریزی سے ترجمہ کی جاتی ہیں مغربی علوم کے پھیلانے میں مدد دیتی ہیں -

گزشتہ سال میں نے آپ سے رام چندر کے عیسائی ہونے کا ذکر کیا تھا اور میں نے اپنے خطبہ میں اُس اخبار کا بھی ذکر کیا تھا جس کے وہ اڈیٹر ہیں - اس سال ایک ہندوستانی شاہزادہ کا ذکر کرتا ہوں اور صرف یہی ایک ہندوستانی شاہزادہ ہے جو ہمارے زمانہ میں عیسائی ہوا ہے - مہاراجہ دلیپ سنگھ لاہور کے شاہی خاندان کا سکھ شاہزادہ ہے - اس نے فتح گڑھ میں گزشتہ مارچ کی آٹھویں تاریخ کو عیسائی مذہب قبول کیا - اس وقت وہ فتح گڑھ ہی میں مقیم ہے -

لیکن ہمیں ہندوستان کے مطابع کی طرف اپنی توجہ مبذول رکھنی چاہیئے - کیونکہ یہی سب سے بڑی چیز ہے جو یورپ کی توجہ کی مستحق ہے - ۱۸۵۱ء کے دوران میں تیس دیسی مطابع میں جس قدر کتابیں چھپی ہیں اُن کا ایک گوشوارہ تیار کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی تعداد ۱۲۶ ہے جن میں سے ۴۸ ہندوستانی ہیں -

افسوس ہے کہ اُن میں سے متعدد کتابوں کے صرف نام لکھے ہیں دوسری کسی قسم کی کیفیت درج نہیں ہے اور محض نام سے کتاب کے متعلق صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ مشرقی کتب کے نام بعض اوقات اصل مضمون سے کچھ تعلق نہیں رکھتے۔ اس لئے حضرات، میں بعض کتابوں کا تذکرہ کرنے سے معذور ہوں۔ ممکن ہے کہ اُن کا جاننا بہت دلچسپ ہوتا۔

ہندی کتب میں سے لایق ذکر مفصلہ ذیل کتابیں ہیں جو آپ کی محتاجِ توجہ ہیں۔

راماین کی شرح جو مہاراجہ بنارس کی فرمایش سے طبع ہو رہی تھی، جنوری ۱۸۵۲ء میں تکمیل کو پہنچ گئی۔

سُجن چوتر۔ یہ کتاب راجۂ بھرت پور کے حکم سے طبع ہوئی۔ اس میں اس لڑائی کا منظوم تذکرہ ہے جو سورج مل (جو راجہ بھرت پور کے بزرگوں میں سے تھے) اور صلابت خاں اور دوسرے افغان سرداروں میں ہوئی تھی۔

نجات المومنین۔ باوجود عربی نام کے یہ کتاب پنجاب کی ہندی بولی میں جسے پنجابی کہتے ہیں لکھی گئی ہے اور لدھیانہ میں چھپی ہے۔

حاتم طائی ہندی منظوم بنارس میں چھپی۔ ایک ہندی لغت مرتبۂ تعشق دہلی میں چھپی ہے۔ یہ صاحب کئی کتابوں کے مؤلف ہیں۔ جو اس سے قبل شایع ہو چکے ہیں اگر میں سرکاری مطبوعات جنتریوں اور چھوٹی چھوٹی مذہبی کتابوں نیز ایسی کتابوں کو جو دوبارہ چھپی ہیں اپنے تبصرہ میں شریک کروں تو یہ فہرست آسانی سے بہت طویل ہو سکتی ہے۔

یہی کیفیت اردو مطبوعات کی ہے جن کی تعداد ان سے کہیں زیادہ ہے۔ کیونکہ ہندی مصنفین بھی زبان کی اسی شاخ میں لکھنا پسند کرتے ہیں جسے مسلمان مصنفین نے قابل تعریف کمال تک پہنچا دیا ہے۔

حضرات۔ اس سال میں اُردو مطبوعات میں سے چند ایسی کتابوں کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں جو حقیقی طور پر قابل قدر ہیں۔

کانپور کا مطبع ہندوستانی مطابع میں بہت ہی معروف و مقبول ہے۔ ۱۸۵۱ء میں اس مطبع میں علاوہ دوسری کتابوں کے ایک نظم "قصۂ منصور" کے نام سے چھپی ہے۔ منصور ایک مشہور حکیم (صوفی)

گزرا ہے۔ جو زیادہ تر "حلاج" کے نام سے معروف ہے۔ اس مشہور شخص پر جو صوفی ہے ۹۲۲ء میں کفر کا فتویٰ لگایا گیا اور اس جرم پر کہ وہ اپنے تئیں "الحق" کہتا تھا جو خدا کا نام ہے قتل کیا گیا۔ صوفیا اُسے شہید سمجھتے ہیں۔ اور اُن کی تصانیف میں اس کا ذکر بہت عزت و حرمت سے کیا گیا ہے۔ بعض لوگ اسے عیسائی خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ دہربوبے نے اپنی کتاب "اورنتیل ببلیوتیک" میں اس کے چند اشعار نقل کئے ہیں جن سے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے اور یہ آخری اشعار تھے جو شہادت سے پہلے اُس کی زبان سے نکلے تھے۔

"حمد ہو ہمیشہ اس کے لئے جس نے اپنی الوہیت کو چھپا کر جو تمام دنیا میں ساری ہے، اپنی انسانیت (انسانی شکل) کو ہم پر ظاہر کیا۔ یہانتک کہ اُس نے خواہش کی کہ وہ ہم کو کھاتا پیتا نظر آئے۔ وہ جو مجھے اپنے دسترخوان پر بلاتا ہے تو بُرا نہیں کرتا کیونکہ وہ مجھے وہی پیالا پینے کو دیتا ہے جو وہ خود پیتا ہے۔ وہ درحقیقت مجھ سے ایسا ہی برتاؤ کرتا ہے جیسا ایک میزبان اپنی مہمان کے ساتھ کیا کرتا ہے۔"

علاوہ اس کے اس مطبع سے مفصلہ ذیل کتابیں شایع ہوئی ہیں۔

مجموعۂ مثنوی - یہ اردو منظوم حکایتوں کا مجموعہ ہے۔ حکایت نصیحت آمیز - نازونیاز یہ خدا اور رسول خدا (صلعم) کی حمد و ثنا میں ہے۔ یہ اُسی قسم کی کتاب ہے جو آگرہ میں نظم نادر کے نام سے شایع ہوئی ہے گلستان مسرت[1] یہ شعرا کے کلام کا مجموعہ ہے جو اس مطبع کے روشن خیال مالک نے انتخاب کیا ہے۔

اب ان اُردو کتب کی طرف آپ کی توجہ منعطف کرتا ہوں جو دوسرے مطبعوں سے شایع ہوئی ہیں۔ اُن میں سے ایک عربی کی مشہور کتاب "مقامات حریری" کا اُردو ترجمہ ہے۔ دہرم سنگھ کا قصہ جو ایک دلچسپ قصہ ہے۔ بوعلی قلندرؒ کی فارسی مثنوی کی شرح۔ بہارستان سخن جو ناسخ، آتش، آباد کے کلام کا مجموعہ ہے۔ میزان عقبیٰ، یہ فارسی کتاب کا ترجمہ ہے تاکہ لوگ کثرت سے مستفید ہوسکیں۔

اس سال کے شروع میں پنجاب کے ایک اخبار نے ایک جدید کتاب کی اطلاع شائع کی ہے یہ میجر ایڈورڈ کی کتاب "پنجاب میں ایک سال" کا ترجمہ ہے۔ اس کے مترجم نواب امام الدین ہیں جو پہلے کشمیر

[1] یہ فارسی شعرا کے کلام کا انتخاب مضامین کی ترتیب سے ہے۔ پروفیسر موصوف غلطی سے اسے اُردو خیال کرتے ہیں (اڈیٹر)

کے گورنر تھے اور جنھوں نے کابل کے محاصرے اور دوسری لڑائیوں میں نمایاں کام کئے ہیں۔

میں ان جغرافی نقشوں کا ذکر نہیں کروں گا جو مختلف مطبعوں میں چھپے ہیں۔ ہر کلاٹس اور ٹیسن کے نقشوں کے بعد سے ممالک مغربی وشمالی کے مطابع میں نہ صرف دنیا کے نقشے بلکہ ہندوستان اور ہر ضلع کے نقشے چھپ کر شایع ہوئے ہیں۔

میں اپنی تعلیم کے دوران میں کئی سال تک "ہندوستانی انتخابات" پڑھاتا رہا ہوں۔ یہ عمدہ انتخاب فاضل مسٹر شکسپیر کا کیا ہوا ہے اور اس وقت ایسٹ انڈیا کمپنی کے کالجوں کے نصاب میں داخل تھا۔ اب اُس کی جگہ طوطا کہانی اور باغ و بہار رکھی گئی ہیں۔ اس سال میں اُن کتابوں کی تعلیم دوں گا۔ نہ صرف ان انگریزوں کے فائدہ کی خیال سے جو میرے لکچروں میں حاضر ہوتے ہیں بلکہ اس خیال سے کہ اُردو میں ان کتابوں کا طرز تحریر نہایت پاکیزہ اور لطیف ہے۔ یعنی یہ ہندوستان کی اُس خوبصورت زبان میں لکھی گئی ہیں جس میں فارسی اور اُس کی معین عربی اعتدال کے ساتھ شریک ہیں ان کتابوں میں استعارات اور دیگر صنائع و بدائع اور لفظی مناسبت کا صرف ایک حد تک استعمال کیا گیا ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن کے اہل مشرق بہت شایق ہیں۔

ان میں سے پہلی کتاب سے آپ واقف ہیں کیونکہ اس کا ترجمہ (*Tales of a Parrot*) کے نام سے ہو چکا ہے۔ لہذا اس کے متعلق مجھے کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ دوسرا ایک مشہور قصّہ ہے۔ اور ہندوستان میں یہ قصّہ کئی صاحبوں نے لکھا ہے۔ اُن سے باغ و بہار نام کا بہت قابل قدر ہے اور ہندوستان میں اس قدر مقبول ہوا ہے کہ بار بار چھپا ہے۔ اور اس میں کا ایک ترجمہ ارمنی زبان میں بھی ہوا ہے۔ علاوہ اور باتوں کے اس میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں اُردو ہندی کی بہت سی ضرب المثلیں اور اشعار بھی جگہ جگہ آتے ہیں۔ اس کا نام باغ و بہار کسی قدر عجیب ہے۔ خود مصنف نے اپنے دیباچے میں اس کی وجہ تسمیہ ان الفاظ میں بیان کی ہے:

"ہم نام ہم تاریخ اس میں نکلتی ہے۔ تب میں نے یہی نام رکھا جو کوئی اس کو پڑھے گا گویا باغ کی سیر کریگا"

جیسا کہ اکثر مشرقی کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ اس قصّے میں کئی اور قصّے شامل ہیں اور (*Orlando Furioso*) کی طرح قصّے کا انجام عام ہے جس میں قصّے کے تمام خاص اشخاص شریک ہیں۔ یہ کتاب کئی شخصوں کی عجیب

وغریب آپ بیتیوں کا مجموعہ ہے جن میں عجائب نگاری کی شان ہرجگہ پائی جاتی ہے اور باوجود بار بار اعادہ کے اہل مشرق اسے بہت پسند کرتے ہیں مگراس سے درحقیقت اکثر اوقات قصوں کا لطف کم ہوجاتا ہی۔ لیکن خوشی کی بات یہ ہی کہ اس میں " اسلامی عجائبات" بھی آجاتے ہیں جو زیادہ قابل قبول اور تشفی بخش ہیں۔

حضرات۔ میں اب آپ سے باغ و بہار کا خلاصہ بیان کرتا ہوں۔ تاکہ آپ کے خیال میں کتاب کا ایک تصور پیدا ہوجائے اور اصل کتاب کے پڑھنے میں آسانی ہو (اس کے بعد کتاب کا خلاصہ ہی جو غیر ضروری سمجھ کر ترجمہ میں چھوڑ دیا گیا)۔

میں نے مختصر طور سے باغ و بہار کا خاکہ آپ کے سامنے کھینچ دیا ہے۔ لیکن اس کتاب کے پڑھتے وقت آپ بہت مفید اور کارآمد بات یہ پائیں گے کہ ان قصوں میں ہر صفحہ پر آپ کو قومی خصوصیات کے متعلق ایسی باتیں ملیں گی جو ہمیں اصلی ہندوستان اور خاصکر اسلامی ہندوستان کے سمجھنے میں بہت کارآمد ہوں گی۔ اس قسم کی باتیں قصے کے ہر صفحے میں پائی جاتی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ بعض جگہ مذہبی جوش اور ظلم کی کارستانیاں اس ناگوار طریقہ سے بیان کی گئی ہیں کہ وہ حصے کسی قدر خلاف قیاس معلوم ہوتے ہیں، لیکن بہت سے حصے ایسے ہیں کہ اُن کا جوڑ بڑی خوبصورتی سے بٹھایا گیا ہے اور درحقیقت بہت دلچسپ ہیں۔

لہذا حضرات اس کتاب میں آپ اس زبان کا مطالعہ کریں گے جو خاص طور پر ہندوستانی کہلاتی ہی اور اس میں آپ اُن الفاظ کو نہیں پڑھیں گے جن کا کوئی مفہوم نہیں، بلکہ ایسے الفاظ دیکھیں گے جو ان اشیاء کا مفہوم بتاتے ہیں جو بہت دلچسپ ہیں اور جہاں تک الفاظ کا تعلق ہے اپ اس کے علاوہ ایک اور بات بھی پائیں گے اور وہ یہ ہے کہ اس کے الفاظ خیالات کی نیابت کرتے ہیں۔ کیونکہ اُن کا تجزیہ کرنے سے ہم ان مادوں تک پہنچتے ہیں جو انڈو یورپین زبانوں کے ایک بہت بڑے مجموعہ کی کنجی ہیں اور خود ہماری زبان بھی انھیں میں شامل ہے اور درحقیقت ہندوستانی کی ایک بہن ہے۔

پیارا پیارا گھر اپنا

(نتیجۂ فکر جناب محمد عظمت اللہ خاں صاحب ۔ بی اے)

۱۔ وہ چین کہاں اپنے گھر کا وہ بات کہاں اپنے گھر کی
پیارا پیارا گھر اپنا
وہ راج کہاں اپنے گھر کا وہ رات کہاں اپنے گھر کی
آنکھوں کا تارا گھر اپنا

۲۔ سکھ چین اگر دنیا میں ہے اپنے ہی گھر میں ملتا ہے
سکھ کا سہارا گھر اپنا
دکھ درد کی گر کوئی دوا ہے اپنے ہی گھر کی سیوا ہے
دکھ کا مداوا گھر اپنا

۳۔ وہ گھر والی سندر چترا گھر کی سیوا کرنے والی
دل کا دلا سا گھر اپنا
آرام ہمیں دینے والی آپ مصیبت بھرنے والی
جان سے پیارا گھر اپنا

۴۔ آنکھوں کے تارے لاڈلے گھر کے سب مل کر گھر سر پہ اٹھاتے
دودھوں نہایا گھر اپنا
کھیلتے ہنستے روٹھتے منتے سنتے کہانی سوتے سلاتے
بسا بسایا گھر اپنا

۵۔ ہم پر جان چھڑکنے والا وہ پروان چڑھانے والا
پالنے والا گھر اپنا
وہ بلوان بنانے والا وہ انسان بنانے والا
ڈھالنے والا گھر اپنا

۶۔ وہ پاک ہوا اپنے گھر کی پیار کی جلا اپنے گھر کی
دل میں سمایا گھر اپنا
ایثار وفا اپنے گھر کی وہ درد دیا اپنے گھر کی
روح پہ چھایا گھر اپنا

۷۔ جڑ بنیاد وطن کی گھر ہے وطن گھروں کا اپنے گھر ہے
اپنے گھروں کا گھر اپنا
اپنے گھر پہ نثار وطن ہے اور وطن کے صدقے گھر ہے
وطن کا شیدا گھر اپنا

۸۔ وطن کی چاہت اپنے گھر سے وطن کی طاقت اپنے گھر سے
وطن کا پیارا گھر اپنا
وطن کی دولت اپنے گھر سے وطن کی عزت اپنے گھر سے
راج دلارا گھر اپنا

غالبؔ کے نئے کلام کا انتخاب

(از جناب مولوی سید ہاشمی صاحب رکن دار الترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن)

کچھ عرصہ ہوا رسالہ اُردو میں ہم مرزا غالب کے غیر مطبوعہ یا نئے کلام پر جو نسخہ حمیدیہ میں چھپا ہے تبصرہ کر چکے ہیں۔ اس کلام کو بغور دیکھنے سے ہمارا یہ خیال درجہ یقین کو پہونچ گیا کہ مرزا غالب کے ابتدائی زمانہ کے اکثر اشعار اگرچہ مشکل ہیں مگر تلف کرنے کے لائق نہیں ہیں، اور اگر سلیقے کے ساتھ ان کی شرح لکھدی جائے تو دیگر "اساتذۂ اردو" کے کلام کی نسبت ان شعروں میں قبولِ خاطر کی صلاحیت کچھ کم نہ نکلے گی۔ اس قسم کی مفصل شرح کا تو نہ معلوم کب موقع آئے گا، سردست جناب اڈیٹر صاحب اُردو کے فرمانے کے مطابق ہم اس نئے کلام کا ایک سرسری انتخاب ناظرین اُردو کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اس میں جہاں تک ہوا آسان شعر چُنے ہیں اور پہلے اُن اشعار کو لیا ہے جن کی ہم طرح غزلیں متداول دیوان میں موجود تھیں۔ بہ الفاظِ دیگر یہ وہ شعر ہیں جنھیں حسب روایت مرزا صاحب کے دوستوں نے قلمزن کیا تھا۔ اور گو اُن حضرات نے اس انتخاب میں کمال دیانت وقابلیت سے کام لیا ہو، بایں ہم، جیسا کہ اپنے تبصرے میں عرض کر چکے ہیں انھوں نے اپنے انفرادی ذوق اور کچھ اہلِ زمانہ کے عام رجحان کے اثر سے بعض وہ شعر بھی خارج کر دیئے جو آج کل ہرگز نظر انداز کرنے کے قابل نہ سمجھے جائیں گے۔

ان اشعار کے بعد اُن غزلوں کا انتخاب کیا ہے جن کا کوئی ہم طرح شعر متداول دیوان میں نہ تھا۔ اور جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں، ظاہرا یہ ابتدائی عمر کا وہی کلام ہے جس کی نسبت مرزا صاحب ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "پندرہ برس کی عمر سے پچیس ۲۵ برس کی عمر تک مضامینِ خیالی لکھا کیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا۔ آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو دُور کیا اوراق یکقلم چاک کئے دس پندرہ شعر واسطے نمونہ کے دیوان میں رہنے دیئے"۔ یہی سبب تھا کہ بہت سے صاف اور اچھے شعر بھی انھی اوراق کے ساتھ اتنے عرصہ تک

ہو وے بے نشان رہی جنھیں بکمال بے دردی سے ”یک قلم چاک“ کر دیا گیا تھا۔

(۱)

(اُن اشعار کا انتخاب جن کی ہم طرح غزلیں متداول دیوان میں موجود ہیں)

تنگیٔ رفیقِ رہ تھی عدم یا وجود تھا ۔۔۔ میرا سفر بہ طالعِ چشمِ حسود تھا
خورِ شبنم آشنا نہ ہوا ورنہ میں اسد ۔۔۔ سر تا قدم گذارشِ ذوقِ سجود تھا!

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب ۔۔۔ ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا
خاکبازیٔ امید کارخانۂ طفلی ۔۔۔ یاس کو دو عالم سے لب بخندہ وا پایا
شب نظارہ پرور تھا خواب میں خیال اس کا ۔۔۔ صبح موجۂ گل کو نقشِ بوریا پایا

کارخانے سے جنوں کے بھی میں عریاں نکلا ۔۔۔ میری قسمت کا نہ ایک آدھ گریباں نکلا
ساغرِ جلوۂ سرشار ہے ہر ذرۂ خاک ۔۔۔ شوقِ دیدار بلا آئینہ ساماں نکلا

یعنی خود شوقِ دیدار نے اِس بلا کی قابلیت عکسِ معشوق لینے کی پیدا کر دی ہے۔

دیدہ تا دل ہے یک آئینہ چراغاں کس نے ۔۔۔ خلوتِ ناز پہ پیرایۂ محفل باندھا؟
مطربِ دل نے مرے تارِ نفس سے غالب ۔۔۔ ساز پر رشتہ پئے نغمۂ بیدل باندھا

اِس غزل کا صرف مقطع متداولِ دیوان میں رہ گیا باقی چھ شعر انتخاب کرنے والوں نے خارج کر دیئے ان میں سے چار نیچے درج ہیں :-

نہ بھولا اضطرابِ دم شماری، انتظار اپنا ۔۔۔ کہ آخر شیشۂ ساعت کے کام آیا غبار اپنا
زبس آتش نے فصلِ رنگ میں رنگِ دگر پایا ۔۔۔ چراغِ گل سے ڈھونڈے ہے چمن میں شمع خار اپنا
اسیرِ بے زباں ہوں۔ کاشکے صیادِ بے پروا ۔۔۔ بہ دامِ جوہرِ آئینہ ہو جائے شکار اپنا

اگر آسودگی ہے مدعائے رنجِ بیتابی — نثارِ گردشِ پیمانۂ مے روزگار اپنا!

مقطع

اسدؔ ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سر و پا ہیں — کہ ہے سرپنجۂ مژگانِ آہو پشت خار اپنا

یہاں اس مطبوعہ مقطع کو نقل کرنے سے ہمیں یہ دکھانا مقصود ہے کہ بعض دفعہ انتخاب کرنے والوں نے آسان شعروں کو کاٹ کر پیچیدہ کو باقی رکھا ہے! ۵

نہ پائی وسعتِ جولانِ یک جنوں ہم نے — عدم کو لے گئے دل میں غبارِ صحرا کا
مرا شمول ہر اک دل کے پیچ و تاب میں ہے — میں مدعا ہوں تپش نامۂ تمنا کا

ضعفِ جنوں کو وقتِ تپش در بھی دور تھا — اک، گھر میں، مختصر سا بیاباں ضرور تھا
اے وائے غفلتِ نگہِ شوق! ورنہ یاں — ہر پارہ سنگ، لختِ دلِ کوہِ طور تھا
درسِ تپش ہے برق کو اب اس کے نام سے — وہ دل ہے یہ کہ جس کا تخلص "صبور" تھا
ہر رنگ میں جلا اسدِ فتنہ انتظار — پروانۂ تجلیِ شمعِ ظہور تھا

ربطِ یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار — سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گل نا آشنا!

اس کے بعد آگے جا کر ’م‘ کی ردیف میں چند شعر اس قابل ملتے ہیں کہ متداول دیوان کی غزل میں انھیں شامل کر لیا جائے:-

فرطِ بیخوابی سے ہیں شب ہائے ہجرِ یار میں — جوں زبانِ شمع، داغِ گرمیِ افسانہ ہم
جانتے ہیں جوششِ سودائے زلفِ یار میں — سنبلِ بالیدہ کو موئے سرِ دیوانہ ہم
بسکہ وہ چشم و چراغِ محفلِ اغیار ہے — چپکے چپکے جلتے ہیں جوں شمعِ ماتم خانہ ہم

اِس جوش انگیز مقطع کو بھی انتخاب کرنے والوں نے خارج کر دیا تھا کہ ؎

قطرہ ہائے خونِ بسمل زیبِ داماں ہیں، اسدؔ
ہے تماشا کردنی گلچینیٔ جلّادیاں

ذیل کے شعروں میں سے مطلع خود مرزا غالب نے گلِ رعنا کے چیدہ اشعار میں داخل کیا تھا ؎

ہے نزاکت بسکہ فصلِ گُل میں معمارِ چمن
قالبِ گُل میں ڈھلی ہے خشتِ دیوارِ چمن

وقت ہے گر بلبلِ مسکیں زلیخائی کرے
یوسفِ گُل جلوہ فرما ہے بہ بازارِ چمن

پھر حلقۂ کاکل میں پڑیں دید کی راہیں
جوں دُود فراہم ہوئیں روزن میں نگاہیں

پایا سرِ ہر ذرہ جگر گوشۂ وحشت
ہیں داغ سے معمور شقایق کی کلاہیں

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنّا
واماندگیِ شوق تراشے ہے پناہیں!

"تکرارِ تمنّا" میں مایوس رہ جانے کا بھی کنایہ تھا اسی لئے دوسرے مصرعے میں وضاحت کی اور یہ نادر مضمون پیدا کیا کہ عشقِ حقیقی تو اس طلب کا نام ہے جس کی اِس دنیا میں کوئی نہایت نہیں۔ پس یہ سالک کے تھک جانے کی دلیل ہے کہ وہ دَیر یا حَرم کو اپنی منزلِ مقصود قرار دے لے۔

ہر چند عمر گذری آزردگی میں لیکن
ہے شرحِ شوق کو بھی جوں شکوہ ناتمامی

ہے یاس میں اسدؔ کو ساقی سے بھی فراغت
دریا سے خشک گزری مستوں کی تشنہ کامی

ذیل کی غزل کا بے نظیر مطلع اور کئی شعر انتخاب کرنے والوں نے خارج کر دیئے تھے :-

نظر بہ نقصِ گدایاں کمالِ بے ادبی ہے
کہ خارِ خشک کو بھی دعویِٔ چمن نسبی ہے

ہوا وصال سے شوقِ دلِ حریص زیادہ
لبِ قدح پہ کفِ بادہ جوشِ تشنہ لبی ہے

مرزا کی عالی ظرفی ہمیشہ "دلِ بے مدّعا" مانگتی ہے لیکن "مدّعا طلبی" کے جو اسباب انھوں نے گِنوائے ہیں

وہ باریک بینی کی انتہا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

خوشا وہ دل کہ سراپا طلسمِ بے خبری ہو
جنون و یاس و الم رزقِ مدّعا طلبی ہے!

چمن میں کس کے یہ برہم ہوئی ہے بزمِ تماشا
کہ برگ برگِ سمن شیشہ ریزۂ حلبی ہے

ذیل کی غزل میں سے صرف دو شعر خارج کئے گئے تھے۔ وہ دونوں ہم نقل کئے دیتے ہیں:۔

ظاہر ہے طرزِ قید سے صیّاد کی غرض
جو دانہ دام میں ہے سو اشکِ کباب ہے

بے چشمِ دل نہ کر ہوسِ سیرِ لالہ زار
یعنی یہ ہر ورق، ورقِ انتخاب ہے

کباب میں سے جو پانی رِستا ہے اسے "اشکِ کباب" کہتے ہیں اور وہی جم کر دانہ بن جاتا ہے۔

کہوں کیا گرمجوشی مے کشی میں شمع رویاں کی
کہ شمعِ خانۂ دل آتشِ مے سے فروزاں کی

ہوا شرمِ تہی دستی سے وہ بھی سرنگوں آخر
بس اے زخمِ جگر اب دیکھ لی شورش نمکداں کی

یہ یادِ گرمیِ صحبت برنگِ شعلہ دہکے ہے
چھپاؤں کیوں کہ غالبؔ سوزشیں داغِ نمایاں کی!

"آئینۂ زانو مجھے" والی غزل کا مطلع، جو بجائے خود فلسفۂ زندگی کا رسالہ ہے، یہ تھا:۔

باعثِ واماندگی ہے عمرِ فرصت جو مجھے
کر دیا ہے پا بہ زنجیرِ رمِ آہو مجھے

"رمِ آہو" سے شاعر نے زنجیرِ زنداں تیار کی ہے اور یہ بالکل نئی تشبیہ ہے۔ شعر کا مقصود یہ ہے کہ قسمت یا فطرت ہی نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ فرصت و فراغت کی تلاش کروں لیکن خود یہ تلاش فرصت کی ضد ہے اور تھکا دینے کے لئے کافی ہے۔

عروجِ نشہ ہے سر تا قدم قدِ چمن رویاں
بجائے خود و گرنہ سرو بھی مینا سے خالی ہے

سیہ مستی ہے اہلِ خاک کو ابرِ بہاری سے
زمیں جوشِ طرب سے جامِ لبریزِ سفالی ہے

اسدؔ اُٹھنا قیامت قامتوں کا وقتِ آرائش
لباسِ نظم میں بالیدنِ مضمونِ عالی ہے!

حُسنِ تخیّل اور قوتِ بیان کے اعتبار سے مجھے اُمید نہیں کہ اُردو شاعری میں مندرجۂ بالا مقطع کی کوئی نظیر آسانی سے مُیسّر آجائے!

ہوبہاں تیرا دماغِ نازِ مستِ بیخودی
خوابِ نازِ گلرخاں دُودِ چراغِ کُشتہ ہی

تر جبیں رکھتی ہی شرمِ قطرہ سامانی مجھے
موجِ گردابِ حیا ہے چینِ پیشانی مجھے
شوق[1] ہی مثلِ حباب از خویش بیروں آمدن
ہے گریباں گیرِ فرصت ذوقِ عریانی مجھے

غم و عشرت قدمبوسِ دلِ تسلیم آئیں ہے
دُعائے مُدّعا گم کردگانِ عشق "آمیں" ہے
پیامِ تعزیت پیدا ہے اندازِ عیادت سے
شبِ ماتم، تہِ دامانِ دُودِ شمعِ بالیں ہے

اسدؔ کو حسرتِ عرضِ نیاز تھی دمِ قتل
ہنوز یک سخنِ بے صدا نکلتی ہی!

"سخن" کا لفظ یہاں مؤنث بندھا ہے آج کل عام طور پر مذکر بولتے ہیں۔ اور "سخنِ بے صدا" کے معنی محض ایک کیفیت کے رہ جائیں گے۔

(۲)

(اُن غزلوں کا انتخاب جن کا کوئی شعر متداول دیوان میں نہ تھا)

بہ رہنِ شرم ہی با وصفِ شہرت اہتمام اُس کا
نگیں میں جوں شرارِ سنگ ناپیدا ہے نام اس کا
اسدؔ سودائے سرسبزی سے ہی تسلیم رنگیں تر
کہ کشتِ خشک اُس کا، ابرِ بے پروا خرام اِس کا

یہ مطلع اور مقطع دونوں لاجواب اور نہایت وسیع معانی کے حامل ہیں۔ پہلا شعر مولانا حسرت گل رعنا سے

---

[1] نسخہ حمیدیہ میں یہ لفظ "شوخ" چھپا ہی۔ میں نے "شوق" بنا دیا۔

نقل کر کے چھاپ چکے ہیں لیکن ان کے ہاں "شہرت" کی جگہ "شوخی" کا رنگین تر لفظ تحریر ہے۔

آخر کار گرفتارِ سرِ زلف ہوا — دلِ دیوانہ کہ وارستۂ ہر مذہب تھا
شوق، سامانِ فضولی ہے وگرنہ غالبؔ — ہم میں سرمایۂ ایجادِ تمنا کب تھا

یک گام بیخودی سے لوٹیں غبارِ صحرا — آغوشِ نقشِ پا میں کیجے فشارِ صحرا
وحشت اگر رسا ہے بے حاصلی ادا ہے — پیمانۂ ہوا ہے مشتِ غبارِ صحرا
اے آبلہ کرم کر یاں رنجہ اک قدم کر — اے نورِ چشمِ الفت اے یادگارِ صحرا
دیوانگی اسدؔ کی حسرت کشِ طرب ہے — در سر ہوائے گلشن در دل غبارِ صحرا

وحشی بن صیاد نے ہم رمخوروں کو کیا رام کیا — رشتۂ چاکِ جیبِ دریدہ صرفِ قماشِ دام کیا
مُہر بجائے نامہ، لگائی بر لبِ پیکِ نامہ رساں — قاتلِ تمکیں سنج نے یوں خاموشی کا پیغام کیا

سیرِ آں سوئے تماشا ہے طلب گاروں کا — خضر مشتاق ہے اس دشت کے آواروں کا
دادخواہِ تپشِ و مہرِ خموشی بر لب — کاغذِ سرمہ ہے جامہ ترے بیماروں کا
پھر وہ سوئے چمن آتا ہے خدا خیر کرے — رنگ اُڑتا ہے گلستاں کے ہواداروں کا
جلوہ مایوس نہیں دل نگرانی، غافل — چشمِ اُمید ہے روزن تری دیواروں کا

تیسرا شعر مرزا صاحب نے خود انتخاب کر کے گلِ رعنا میں درج کیا تھا اور مولانا حسرت کے ہاں چھپ چکا ہے۔ اور چوتھے شعر میں "دل نگرانی" سے دلی نگرانی یا آرزوئے حقیقی مراد ہے۔

ذیل کی ہوائی غزل ہم پہلے اپنے تبصرے میں نقل کر چکے ہیں۔ چند شعر یہاں انتخاب کرتے ہیں:-

بہ مہرِ نامہ جو بوسہ گلِ پیام رہا — ہمارا کام ہوا اور تمہارا نام رہا
ہوا نہ مجھ سے بجز دردِ حاصلِ صیاد — بسانِ اشک گرفتارِ چشمِ دام رہا
دل و جگر تفِ فرقت سے جل کے خاک ہوئے — ولے ہنوز خیالِ وصال خام رہا
شکستِ رنگ کی لائی سحر شبِ سنبل — پہ زلفِ یار کا افسانہ ناتمام رہا

قطعِ سفرِ ہستی و آرامِ فنا، ہیچ — رفتار نہیں بیشتر از لغزشِ پا ہیچ
حیرت ہمہ اسرار پہ مجبورِ خموشی — ہستی نہیں جز بستنِ پیمانِ وفا ہیچ
کس بات پہ مغرور ہی اے عجزِ تمنّا — سامانِ دعا، وحشت و تاثیرِ دعا ہیچ
آہنگِ اسد میں نہیں جز نغمۂ بیدل — عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

اے نوا سازِ تماشا سر بکف جلتا ہوں میں — اک طرف جلتا ہی دل اور اک طرف جلتا ہوں میں
شمع ہوں لیکن بہ پا در رفتۂ خارِ جستجو — مدّعا گم کردہ ہر سو ہر طرف جلتا ہوں میں

فتادگی میں قدم استوار رکھتے ہیں — برنگِ جادہ سرِ کوی یار رکھتے ہیں
جنونِ فرقتِ یارانِ رفتہ ہی غالبؔ — بسانِ دشت دلِ پُرغبار رکھتے ہیں

گر یاس سر نہ کھینچے تنگی عجب فضا ہی — وسعت گہِ تمنّا یک نام و صد ہوا ہی
نے حسرتِ تسلّی نے ذوقِ بیقراری — یک درد و صد دوا ہی یک دست و صد دعا ہے
ہر نالہ اسدؔ ہے مضمونِ دادخواہی — یعنی سخن کو کاغذ احرامِ مدعا ہے

نفس بہ نالہ، رقیب و نگہ بہ اشک، عدو — زیادہ اُس سے گرفتار ہوں کہ تو جانے!

زباں سے عرضِ تمنّائے خامشی معلوم — مگر وہ خانہ براندازِ "گفتگو" جانے؟

عذارِ یار نظر بندِ چشمِ گریاں ہے — عجب کہ پرتوِ خور شمعِ شبنمستاں ہے
کشودِ غنچۂ دلہا عجب نہ رکھ، غافل — صبا خرامیِ خوباں بہار ساماں ہے

فرصت، آئینۂ صد رنگِ خود آرائی ہے — روز و شب یک کفِ افسوسِ تماشائی ہے

نوائے خفتۂ الفت اگر بیتاب ہو جاوے — پرِ پروانہ تارِ شمع پر مضراب ہو جاوے
برنگِ گل اگر شیرازہ بندِ بیخودی رہیے — ہزار آشفتگی مجموعۂ یک خواب ہو جاوے
اسد باوصفِ عجز و بے تکلف خاک گردیدن — غضب ہے گر غبارِ خاطرِ احباب ہو جاوے

تا چند نازِ مسجد و بُت خانہ کھینچیے — جوں شمع، دل بہ خلوتِ جانانہ کھینچیے
عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر — دامن کو آج اس کے حریفانہ کھینچیے!
ہے ذوقِ گریہ عزمِ سفر کیجیے اسد — رختِ جنونِ سیل بہ ویرانہ کھینچیے

گل سر بسر اشارۂ جیبِ دریدہ ہے — نازِ بہار جز بہ تقاضا نہ کھینچیے
گر صفحے کو نہ دیجیے پردازِ سادگی — جز خطِ عجز نقشِ تمنّا نہ کھینچیے
خود نامہ بن کے جائیے اُس آشنا کے پاس — کیا فائدہ کہ منّتِ بیگانہ کھینچیے

پرِ طاؤس تماشا نظر آیا ہے مجھے — ایک دل تھا کہ بصد چشم دکھایا ہے مجھے
جامِ ہر ذرّہ ہے سرشارِ تمنّا مجھ سے — کس کا دل ہوں کہ دو عالم سے لگایا ہے مجھے

جوشِ فریادسے لوں گا دیتِ خواب اسدؔ — شوخیٔ نغمۂ بیدلؔ نے جگایا ہے مجھے

فسردگی میں ہے فریادِ بیدلاں تجھسے — چراغِ صبح و گُلِ موسمِ خزاں تجھسے
نیاز پردۂ اظہارِ خود پرستی ہے — جبینِ سجدہ فشاں تجھسے، آستاں تجھسے!

رنجشِ یارِ مہرباں عیش و طرب کا ہے نشاں — دل سے اُٹھا ہے جو غبار گردِ سوادِ باغ ہے
شعر کی فکر کو اسدؔ چاہیئے ہے دل و دماغ — عُذر۔ کہ یہ فسردہ دل بے دل و بے دماغ ہے

مرزا غالب کے اُس کلام کا جو مدّتِ دراز تک بے نشان رہنے کے بعد اب روشنی میں آیا ہے، سرِ دست یہ مختصر انتخاب شایقین کو اِس طرف متوجہ کرنے کے لئے کافی ہے۔ اِس نمونے کو دیکھکر بھی اِس بات کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہو سکے گا کہ مرزا کی اُردو شاعری کن کن مراحل سے گزری ہے۔ ان کے ابتدائی کلام میں بے شبہ بعض خامیاں ہیں لیکن انھی خامیوں کی تہ میں شاعر کی حیرت انگیز وسعتِ نظر اور تخیّل کی وہ خداداد قوّت اور بلندی نظر آتی ہے جن کی بدولت یقین ہے کہ غالبؔ کا شمار ایک دن دُنیا کے چند بہترین شعرا میں ہو کر رہے گا۔

یہودی (از روسی مصنف ٹرگی نف)

(ترجمہ جناب سید تفضل حسین صاحب)

"کرنل صاحب، آج تو ہمیں کوئی قصہ سنائیے"۔ ہم نے آخرکار نکولے ایلی ایچ سے فرمائش کی۔

کرنل مسکرایا۔ سگار کا کش لے کر اس ترکیب سے دھواں چھوڑا کہ وہ بل کھاتا ہوا اس کی موچھوں کے درمیان سے نکلنے لگا۔ اپنے سفید بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ ہم پر ایک نظر ڈالی اور آنکھیں بند کر لیں گویا کچھ سوچ رہا ہے۔ نکولے سے ہم لوگ بہت مانوس تھے اور اس کا ادب کرتے تھے، کیوں کہ زندہ دل اور خوش مذاق افسر ہونے کے علاوہ وہ خصوصاً ہم نوجوانوں سے بہت ہی شفقت اور بے تکلفی سے پیش آتا تھا۔ وہ کشیدہ قامت، فراخ سینہ اور قوی الجثہ آدمی تھا۔ اس کا سانولا اور شاندار روسی چہرہ، اس کی آنکھیں جن سے ذہانت اور راستی ٹپکتی تھی، اس کی زیر لب مسکراہٹ، اس کی بلند مگر ملائم آواز، غرض اس کی ہر بات ملنے والوں کے دل کو خوش کرتی اور اپنی طرف کھینچتی تھی۔

"اچھا تو سنئے"، اس نے شروع کیا۔

۱۸۱۳ء کا واقعہ ہے۔ ہم نے ڈینزگ کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ اس وقت میرا تعلق سپردار سواروں کی رجمنٹ ہی سے تھا اور مجھے یاد ہے، میں نے انھیں دنوں میں کارنٹ (سب لفٹننٹ) کے درجہ پر ترقی پائی تھی۔ لڑائی ... ایک تفریح بخش مشغلہ ہے اور سربراہی کی مہمیں بھی بجائے خود دلچسپی سے خالی نہیں ہیں، مگر محاصرہ کن فوج میں سپاہیوں کو غضب کی کاہلی سے سابقہ پڑتا ہے۔

دن بھر کسی خندق یا خیمے کے اندر کیچڑ یا گھاس پر بیٹھے ہوئے ہیں اور صبح سے لے کر شام تک سارا وقت پتے کھیلنے میں گزرتا ہے۔ کوئی بیکاری سے گھبرا اٹھا تو باہر جا کھڑا ہوا کہ تھوڑی دیر بم کے گولوں اور بندوقوں کی گولیوں کو ہوا میں اڑتے ہوئے دیکھ کر ہی دل بہلائے۔

پہلے تو قلعبند فرانسیسی وقتاً فوقتاً اپنے اچانک دھاووں سے ہماری دلچسپی کا سامان کرتے رہے، مگر بعد چندے انھوں نے یہ سلسلہ بند کر دیا۔ ادھر اپنی یغمائی مہموں سے ہم خود بھی بہت جلد اُکتا گئے۔ آخر خالی بیٹھے بیٹھے یہاں تک نوبت پہونچی کہ قریب تھا مارے وحشت کے ہم چیخیں مارنے لگیں۔ اس وقت میری عمر ۱۹ سال سے زیادہ نہ تھی۔ تندرست، توانا اور پھول کی طرح تر و تازہ تھا۔ اگر کوئی فکر تھی، تو بس اتنی کہ تفننِ طبع کا نت نیا سامان ہوتا رہے، دشمن کے مقابلہ میں یا اور کسی طرح سے ۔ ۔ ۔ آپ میرے مطلب کو پہونچ گئے ہوں گے۔ چنانچہ ایک اسی قسم کا واقعہ پیش آیا۔ کام تو کچھ تھا نہیں، میں نے جُوا کھیلنا شروع کر دیا۔ چند تباہ کن نقصان اُٹھانے کے بعد دفعتہً میری قسمت نے پلٹا کھایا اور صبح ہوتے ہوتے (عموماً ہم رات کے وقت کھیلا کرتے تھے) میں نے ایک کثیر رقم جیت لی۔ تھکن اور نیند میں چور خیمہ سے نکل کر میں کھُلے میدان میں گیا اور ایک ٹیلے پر جا بیٹھا۔ میں آپ سے کیا کہوں، کیسا سہانا اور پُر فضا وقت تھا۔ ہماری قلعبندی کے طویل سلسلہ کو کہر نے نظروں سے غائب کر دیا تھا۔ میں نظارہ کرتا رہا، یہاں تک کہ تکان غالب آگئی اور جہاں بیٹھا تھا وہیں اونگنے لگا۔

کسی کے جان بوجھکر کھنکارنے سے میں چونک پڑا۔ آنکھیں کھول کر دیکھا تو ایک یہودی کو اپنے سامنے کھڑا پایا۔ وہ ایک چالیس سالہ ادھیڑ آدمی تھا، خاکی رنگ کا ڈھیلا ڈھالا لبادہ پہنے ہوئے تھا، پاؤں میں سلیپر اور سر پر ہلکی سی سیاہ ٹوپی تھی۔ اِس کا نام گرشیل تھا اور وہ ہمیشہ ہمارے کیمپ میں گھومتا رہتا تھا: کسی کو شراب لادی، کسی کو کچھ اور سامان فراہم کر دیا، غرض وہ ہم لوگوں کی ایسی ہی چھوٹی موٹی ضرورتیں پُوری کر دیتا تھا۔ وہ دُبلا پتلا، پستہ قد، سُرخ مو اور چیچک رُو تھا۔ اِس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں بھی سُرخ تھیں، اور لگاتار جھپکتی رہتی تھیں، ناک سُتواں اور خمدار تھی، اور وہ پیہم کھانستا رہتا تھا۔ اِس نے میرے سامنے جلد جلد پیترے بدلنا اور جھک جھک کر کورنش بجالانی شروع کی آخر میں نے پوچھا۔

کہو، تم کیا چاہتے ہو۔

جی میں ۔ ۔ ۔ میں صرف اس واسطے آیا ہوں، کہ شاید حضور کو مجھسے کوئی کام ہو۔

مجھے تم سے کوئی کام نہیں، جاؤ اپنا کام کرو۔

جو حکم، بسر و چشم! میں تو حضور کا، ایک ادنیٰ سا خادم ہوں۔ میں نے خیال کیا تھا، شاید کہ

حضور، کوئی خدمت ۔ ۔ ۔'

ناحق پریشان کرتے ہو جی ۔ ۔ ۔ چلے جاؤ، بس کہدیا۔

واقعی ۔ ۔ حضور ۔ ۔ ۔ واقعی ۔ ۔ ۔ مگر، حضور عالی ۔ ۔ ۔ خادم کو ۔ ۔ ۔ مبارکباد عرض کرنے کی اجازت تو ضرور ملنی چاہیئے ۔ ۔ ۔'

خوب! یہ تم کو کیسے معلوم ہوا؟'

جی، مجھے معلوم ہی ۔ ۔ اچھی طرح معلوم ہے ۔ ۔ ۔ ایک کثیر رقم ۔ ۔ ۔ بہت کثیر ۔ ۔ جی ہاں بہت ہی کثیر۔' یہ کہکر گرشل نے ہاتھ پھیلا دیئے اور گردن مٹکانے لگا۔

مگر خالی خولی باتوں سے فائدہ ؟' میں نے جھنجھلا کے کہا، ایسی منحوس جگہ، بھلا روپیہ کس کام آسکتا ہی؟

جی واہ! ۔ ۔ ایسا نہ فرمایئے حضور، ۔ ۔ ۔ روپیہ بڑی چیز ہے، ہمیشہ کارآمد ۔ ۔ ۔ روپیہ سے آپ جو چیز چاہیں پیدا کر سکتے ہیں ۔ ۔ ۔ حضور، جو چیز چاہیں ۔ ۔ ۔ بس حکم کی دیر ہی، اور آپ کا خادم، دیکھئے، ہر چیز پیدا کردیگا ۔ ۔ حضور، ہر چیز! ہر چیز!'

ابے جا، کیوں باتیں بناتا ہی۔

یہودی اپنی زلفوں کو جھٹک کر بولا' وائے، وائے! حضور کو میرا یقین نہیں آتا ۔ ۔ ۔ وائے اے وائے! پھر آنکھیں بند کرلیں اور سر دھنے لگا۔

آہا ۔ ۔ ۔ میں پاگیا، حضور کا دل کیا چاہتا ہے، میں پاگیا ۔ ۔ ۔ جی ہاں، پاگیا۔ یہودی نے اب بالکل ایسے تیور اختیار کرلئے گویا وہ میرا محرم راز ہی۔

واقعی!'

پھر اس نے چوکنا ہوکر اپنے اردگرد نظر ڈالی اور میری طرف کو جھکا۔

اے حضور! ایسی پیاری صورت ہے کہ میں آپ سے کیا کہوں، بہت ہی پیاری ۔ ۔ ۔ گرشل نے پھر آنکھیں بند کرلیں اور ہونٹ چبانے لگا۔

حضور، بس حکم کی دیر ہی ۔ ۔ ۔ آپ خود دیکھ لیں گے ۔ ۔ ۔ یاد رکھئے میں کیا کہتا ہوں ۔ ۔ ۔ مگر آپ کو یقین ہی

نہیں آتا۔۔ ۔۔ اچھّا تو لا کر نہ دکھادوں۔۔ ۔۔ بات تو جبھی ہے۔

میں چُپ چاپ اِس کا مُنہ تکتا رہا۔

بس تو یہی ٹھیک ہے۔ ہاں یہی ٹھیک ہے۔ میں لا کے دکھا دیتا ہوں۔

یہ کہکر گرشیل ہنسا اور آہستہ آہستہ میری پیٹھ تھپکی مگر پھر فوراً ہی زقند بھر کر دُور جا کھڑا ہوا، گویا اُس پر کسی نے کھولتا ہوا پانی ڈال دیا ہے۔

مگر حضور، کچھ تھوڑا سا پیشگی نہیں دلوایئے گا؟

مگر تم مجھے چکمہ تو نہ دوگے؟ کہیں اودھر اُدھر سے کسی ٹکٹی چڑیل کو لا کے سامنے کھڑا کردو۔

اجی واہ، آپ کیا فرماتے ہیں، حضور؟۔۔ ۔۔ یہودی نے ہاتھوں کو جھٹک کر غیر معمولی جوش کے ساتھ کہا۔ یہ آپ نے کیوں کر۔۔ ۔۔؟ واہ، وا! اگر میں ایسا کروں تو آپ حکم دیجیے، حضور کہ پانسو، جی ہاں، پورے پانسو کوڑے میری پیٹھ پر لگائیں۔ پھر جلدی سے پوچھا تو آپ حکم دیتے ہیں؟

اس وقت میرے ایک ہمردیف نے اپنے خیمہ کی چاپ اُٹھائی اور مجھے نام لے کر پکارا۔ میں جلدی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور ایک اشرفی یہودی کی طرف پھینکدی۔

یہودی "آج رات کو، آج رات کو،" بڑبڑاتا ہوا پیچھے رہ گیا۔

رات کب ہوتی ہے، دوستو، میں آپ سے اقرار کرتا ہوں، اس انتظار میں میرا دل بہت ہی بے قرار رہا۔ اسی روز اتفاق سے فرانسیسیوں نے چھاپا مارا اور ہماری رجمنٹ ان کے مقابلہ پر بھیجی گئی۔ شام ہوئی۔ لوگ جا بجا آگ کے گرد بیٹھے تھے۔ سپاہی کھانا پکا رہے تھے۔ میں بھی ایک جگہ لبادہ بچھا کر لیٹ گیا۔ چا ء پی۔ دوستوں کے قصّے کہانیاں سُنتا اور ہنکارے بھرتا رہا۔ تاش کھیلنے کی تجویز ہوئی، میں نے حصّہ لینے سے انکار کردیا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا۔ ایک ایک کرکے سب افسر اپنے خیموں میں چلے گئے۔ آگ بجھنے لگی۔ سپاہی تِتر بِتر ہوگئے یا وہیں لمبی تان کر سوگئے۔ چاروں طرف خاموشی چھاگئی۔ میں نے اُٹھنے کا نام نہ لیا۔ میرا اردلی بیٹھا آگ تاپ رہا تھا اور اونگتا جاتا تھا۔ میں نے اسے بھی پروانگی دیدی۔ دیکھتے دیکھتے سارے کیمپ میں سناٹا ہوگیا۔ میں اب بھی وہیں لیٹا تھا گویا کسی کا منتظر ہوں۔ رات بہت آچکی تھی تارے جھلملا رہے تھے۔ بڑی دیر تک میں شعلوں کو دم توڑتے ہوئے دیکھتا رہا۔ آخری شعلہ بھی گل ہوگیا۔ ملعون یہودی

تو نے خوب چلمہ دیا! اس خیال سے دل میں پیچ و تاب کھا کر میں اُٹھنے والا ہی تھا کہ قریب سے اے حضور! کی کانپتی ہوئی آواز میرے کان میں آئی۔ آنکھ اُٹھا کر دیکھا تو گرشیل۔ اس کا منھ بالکل فق تھا۔ زبان لکنت کرتی تھی۔ آہستہ سے میرے کان میں کہا۔

آیئے حضور، آپ کے خیمے میں چلیں۔

میں اُٹھ کھڑا ہوا اور اس کے پیچھے چلا۔ یہودی دبکتا سکڑتا نرم نرم گیلی گھاس پر پھونک پھونک کر قدم دھر رہا تھا کہ یکایک مجھے ایک شکل نظر آئی جو بُرقعے میں لپٹی ہوئی بے حس و حرکت ایک طرف کو کھڑی تھی۔ یہودی نے اُسے اشارہ سے بُلایا۔ ۔ ۔ وہ اس کے پاس جا کھڑی ہوی۔ اس نے کچھ اس کے کان میں کہا، میری طرف پھرا کئی بار سر ہلایا اور ہم تینوں خیمے میں داخل ہوئے۔ آپ سن کر ہنسیں گے، میری اوپر کی سانس اوپر تھی اور نیچے کی نیچے۔ یہودی دبی زبان سے اٹک اٹک کر کہنے لگا، حضور، آپ دیکھتے ہیں۔ ۔ ۔ آپ دیکھتے ہیں اس وقت یہ کچھ ڈر گئی ہے، حضور، ڈر گئی۔ حالاں کہ میں نے اس کو سمجھا دیا ہے کہ حضور والا بہت عمدہ افسر ہیں اور بڑے ہی شریف آدمی ہیں۔ ۔ ۔ ڈرو مت ۔ ۔ ۔ ڈرو مت ۔ ۔ ۔ مکرّر کہا، ڈرو مت۔

بُرقعہ پوش شکل بت کی طرح ساکت و صامت تھی۔ میں بھی بے طرح سِٹ پٹایا ہوا تھا اور کوئی بات نہ سوجھتی تھی۔ ادھر گرشیل کی بے قراری کا یہ حال تھا کہ ایک جگہ نچلا کھڑا نہ ہوتا تھا اور عجیب عجیب اشارے کر رہا تھا۔

میں نے اس سے کہا، بس آپ اب باہر جایئے۔

وہ چلا تو گیا مگر معلوم ہوتا تھا، بڑی بیدلی سے اس نے میرے حکم کی تعمیل کی ہے۔

میں بُرقعہ پوش شکل کے پاس آیا اور نقاب اس کے چہرہ سے اُلٹ دیا۔

قلعہ کے اندر آگ بھڑکی، اتنے فاصلہ پر اس کی جو کچھ ہلکی سی سُنہری جوت پہونچ سکی، اس میں مجھے ایک نوجوان یہودن کا زرد چہرہ نظر آیا۔ اس کی خوبصورتی دیکھکر میں دنگ رہ گیا۔ میں اس کی طرف مُنہ کر کے کھڑا ہو گیا اور چپ چاپ اس کی صورت تکنے لگا۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں خفیف سی سرسراہٹ پر میں نے نظر اُٹھا کر دیکھا کہ گرشیل خیمے کا کونہ اُٹھا کر باحتیاط تمام اندر جھانک رہا ہے۔ میں نے جھنجھلا کر اشارہ کیا، چلے جاؤ، وہ غائب ہو گیا۔

میں نے جی کڑا کر کے پوچھا، تمہارا کیا نام ہے؟

جواب دیا، سارہ۔

دفعتہً اس کی بڑی بڑی لبھوئی آنکھوں اور اس کے چھوٹے چھوٹے ہموار چمکیلے دانتوں کی سفیدی بجلی کی طرح میری آنکھوں میں پھر گئی۔

میں نے دو چرمی گدّے گھسیٹ لئے اور زمین پر بچھا کر اس سے بیٹھنے کے لئے کہا۔ اس نے دوشالہ اُتار ڈالا اور بیٹھ گئی۔ وہ کاسک وضع کی چُست، اونچی جاکٹ پہنے تھی کہ سامنے سے کھلی ہوئی، اور اس میں چاندی کی نقشین گول گھنڈیاں لگی تھیں۔ بالوں کے موٹے سیاہ جوڑے کو اس نے اپنے نازک سر کے گرد دوہرا پیچ دیکر لپیٹ رکھا تھا۔ میں اس کے پہلو میں بیٹھ گیا اور اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔ اس نے تھوڑی سی مزاحمت کی، مگر اتنی جرأت نہ تھی کہ مجھ سے آنکھ ملاتی اور اس کی سانس بھی کچھ اُکھڑی ہوئی سی تھی۔ میں اس کی مشرقی سج دھج پر عش عش کر رہا تھا اور ڈرتے ڈرتے اس کی سرد کانپتی ہوئی اُنگلیوں کو دبا رہا تھا۔

کیا تمھیں روسی آتی ہے؟

ہاں، تھوڑی سی۔

کیا تم روسیوں کو چاہتی ہو؟

ہاں چاہتی ہوں۔

تو پھر تم مجھے بھی چاہتی ہو؟

ہاں، میں تمھیں چاہتی ہوں۔

اب میں نے ارادہ کیا کہ اُسے بغل میں لیلوں مگر وہ تڑپ کر الگ جا بیٹھی۔

جی نہیں، جی نہیں، معاف فرمایئے۔

اچھا خیر، میری طرف دیکھو تو سہی۔

اس نے اپنی کالی کالی دل میں کھبنے والی آنکھیں مجھ سے چار کیں مگر پھر فوراً ہی شرما کر نیچے دیکھنے لگی۔

میں نے بشوق تمام اس کا ہاتھ چوم لیا۔ اس نے کن انکھیوں سے مجھے گھورا اور آہستہ آہستہ ہنسنے لگی۔

یہ کیا ہے؟

اس نے آستین سے منہ چھپا لیا اور کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ خیمے کے دروازہ پر گریشل نے نمودار ہو کر اس کی طرف اُنگلی سے اشارہ کیا۔

اس کی ہنسی موقوف ہو گئی۔

میں نے دانت پیس کر کہا۔ چلے جاؤ، تم نے میری جان ضیق میں ڈال دی۔ گریشل وہیں کھڑا رہا۔ میں نے پیٹی کھول کر مٹھی بھر اشرفیاں نکالیں اور اس کے ہاتھ میں رکھ کر باہر دھکیل دیا۔ حضور مجھے بھی سارہ نے کہا۔

میں نے چند اشرفیاں اس کی گود میں بھی ڈال دیں۔ وہ اُن پر یوں جھپٹی جیسے بلّی۔

اب تو میں ضرور پیار لوں گا۔

نہیں، جی نہیں، حضور، اس نے لجا کر کہا۔

آخر تم کیوں ڈرتی ہو؟

جی ہاں، میں ڈرتی ہوں۔

یہ کیا واہیات ہے؟

جی نہیں۔

وہ مجھے سہمی ہوئی نگاہوں سے دیکھنے لگی، سر کو ایک طرف جھکا لیا اور اُنگلیوں میں اُنگلیاں ڈال کر ایک انگڑائی لی۔

پھر تھوڑے سے سکوت کے بعد بولی، اگر آپ چاہتے ہیں تو۔۔۔ یہ لیجئے۔

اس نے اپنا ہاتھ میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ میں نے اُسے بوسہ تو دیا مگر زیادہ شوق سے نہیں۔ سارہ پھر ہنسنے لگی۔

میرا خون کھول رہا تھا۔ مجھے اپنے اوپر غصّہ آ رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں، واقعی میں نے اپنے دل میں کہا کہ میں بھی کیسا اُلّو ہوں۔

میں پھر اس کی طرف متوجّہ ہوا۔

سارہ، سنو، میں تم پر دل وجان سے عاشق ہوں۔

میں جانتی ہوں۔

تم جانتی ہو؟ اور تم خفا تو نہیں ہو؟ کیا تم بھی مجھے چاہتی ہو؟

سارہ نے سر ہلایا۔

میں نے کہا، نہیں، صاف صاف جواب دو۔

اچھّا تو آپ مجھے اپنی صورت دکھایئے۔

میں اس کی طرف جھک گیا۔ اس نے اپنے ہاتھ میرے شانوں پر رکھدیئے اور میرے چہرہ کو غور سے دیکھنے لگی۔ تیوری چڑھائی، مسکرائی۔ مجھے اپنے نفس پر قابو نہ رہا اور بے اختیار ہو کر اس کا مُنہ چوم لیا۔ وہ اُچھل پڑی اور ایک پھلانگ میں دروازہ پر جا کھڑی ہوئی۔

میں نے کہا، لے آؤ بھی، کیسی شرمیلی ہو۔

اس نے میری بات کا جواب نہ دیا اور وہیں کھڑی رہی۔

میں نے پھر بُلایا کہ آؤ یہاں آکر بیٹھو۔

بولی، نہیں حضور، اب رخصت، پھر کسی وقت سہی۔

گرشیل نے پھر جھانک کر دیکھا۔ دو ایک کلمے اس کے کان میں کہے۔ وہ خم ہوئی اور سانپ کی طرح سٹک گئی۔ میں خیمے سے نکل کر اس کے تعاقب میں چلا، مگر نہ تو اسی کی پرچھائیں ملی اور نہ گرشیل کی۔ رات بھر میری پلک سے پلک نہیں جھپکی۔

دوسری رات کو ہم کپتان کے خیمے میں بیٹھے تھے۔ میں پتے کھیل رہا تھا مگر طبیعت اُچاٹ تھی۔ اتنے میں اردلی نے حاضر ہو کر کہا۔

حضور، کوئی شخص آپ سے ملنے آیا ہے۔

کون؟

ایک یہودی۔

مجھے تعجب ہوا، گرشیل تو نہیں ہی۔ میں نے بازی ختم ہونے تک کھیل جاری رکھا۔ پھر اُٹھ کر باہر آیا۔
میرا خیال صحیح نکلا۔ گرشیل ہی تھا۔ کیا ڈھیٹھ تھا، چھوٹتے ہی پوچھا

ہاں تو فرمایئے حضور، آپ کا دل خوش ہوا ؟

ارے تجھ پر خدا کی ۔۔ ۔۔ ! اس وقت کرنل نے اپنے ارد گرد دیکھکر کہا، (یقیناً یہاں کوئی لیڈی تو
موجود نہیں ہی ۔۔ ۔ اچھّا تو مضائقہ نہیں، القصہ !)

ہاں، تجھے خدا سمجھے۔ میں نے کہا، تو آپ مجھسے دل لگی کر رہے ہیں۔

کیوں جی ؟

یہ کیسے ؟

یہ کیسے ! کیا اچھّا سوال ہی !

جی، جی، آپ بڑے خراب آدمی ہیں؛ حضور، لڑکی ٹھیری کم سن اور شرمیلی ۔۔ ۔۔ آپ نے اس کو ڈرا دیا
بیشک ڈرا دیا۔ گرشیل نے طنزیہ کہا مگر ساتھ ہی مُسکراتا بھی جاتا تھا۔

نرالی شرم ہی ! اچھّا تو اس نے روپیہ کیوں لیا ؟

تو پھر کیا ہوا ؟ کوئی روپیہ دیتا ہو تو کیوں نہ لیں ؟

گرشیل سنو، اسے پھر لاؤ، ورنہ میں تم سے دست بردار نہ ہونگا۔ مگر اتنی مہربانی کرو کہ اسے یہاں چھوڑکر
تم اُلٹے پاؤں چلے جاؤ اور ہمیں تھوڑی دیر چین سے بیٹھنے دو۔ سُنتے ہو ؟

گرشیل کی آنکھوں سے چنگاریاں اُڑنے لگیں۔

یہ آپ کیا فرماتے ہیں ؟ آپ کو اس سے محبّت ہی ؟

ہاں، ہی۔

کیا پیاری صورت ہی ! ایسی اور کہیں نہ ہوگی۔ فرمایئے، مجھے اس وقت کچھ دلوایئے گا ؟

ہاں لو، مگر اتنا خیال رہے کہ راست بازی کے سامنے روپیہ کوئی چیز نہیں۔ اس کو لاؤ اور تم یہاں سے
کالا مُنہ کرو۔ میں آپ اُسے مکان پہونچا آؤں گا۔

یہودی نے چھوٹتے ہی جواب دیا، جی نہیں، صاحب، یہ نہیں ہو سکتا، ناممکن، بالکل ناممکن۔ میں حضور خیمے کے آس پاس ہی ٹہلتا رہوں گا اور ایسا ہی ہے تو خیر۔ ۔ ۔ تھوڑی دیر کے لئے چلا جاؤں گا۔ ۔ ۔ ۔ میں تو حضور کی خوشی چاہتا ہوں۔ ۔ ۔ میں ہٹ جاؤں گا۔ ۔ ۔ یقین مانئے ہٹ جاؤں گا۔

ہاں ضرور ہٹ جانا اور اس کو لانا، سُنتے ہو۔

کیوں نہ ہو، حضور، وہ ہی بھی حسین، جی ہاں، حسین، کیسی حسین! گرشیل جھک پڑا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگا۔

ہاں وہ طرحدار ہے۔

تو اس بات پر ایک اشرفی اور عنایت ہو۔

میں نے ایک اور اشرفی اس کی طرف پھینکدی اور ہم ایک دوسرے سے رُخصت ہوئے۔

دن جوں توں کرکے تمام ہوا۔ رات آئی۔ میں بہت دیر تک اپنے خیمے میں اکیلا بیٹھا رہا۔ باہر اندھیرا گھپ تھا۔ شہر کے گھڑیال نے دو بجائے۔ قریب تھا کہ میں یہودی پر لعنت بھیجنا شروع کروں کہ دفعتہً سارہ اندر آئی۔ تنہا۔ میں اُچھل پڑا۔ اس کو اپنے آغوش میں لے لیا اور مُنہ پر مُنہ رکھدیا۔ اس کا جسم مثل برف کے ٹھنڈا تھا۔ مجھے اس کی صورت اچھی طرح نظر نہ آتی تھی۔ میں نے اس کو نیچے بٹھایا۔ سامنے جھک کر اس کے منہ کے قریب اپنا منہ لے گیا۔ اس کے ہاتھ تھام لئے۔ اس کی کمر سہلائی۔ اس نے کچھ بات کی نہ ہاتھ پاؤں ہلائے مگر ایک بارگی بلند آواز سے سسکیاں بھرنے لگی۔ میں نے دلاسا دیا، منّت کی مگر کچھ اثر نہ ہوا، وہ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں نے اس کو گلے سے لگا لیا، اس کے آنسو پاک کئے۔ پہلے کی طرح اس نے مزاحمت نہیں کی، نہ میری باتوں کا جواب دیا مگر زار زار ابر نوبہار کی طرح روتی رہی۔ میرے دل میں ایک ٹیس سی اُٹھی اور اُٹھکر باہر چلا گیا۔ گرشیل زمین سے سر نکالتا ہوا نظر آیا۔ میں نے کہا۔

گرشیل لو یہ زرِ موعود حاضر ہے، سارہ کو لیجاؤ۔

یہودی فی الفور طرارہ بھر کر اس کے پاس گیا، وہ رونا دھونا موقوف کرکے اس سے چمٹ گئی۔

خدا حافظ! سارہ، میں نے کہا، خدا تم کو اچھا رکھے، الوداع، زندگی ہے تو پھر کسی وقت ملیں گے۔

گرشیل خاموش تھا، اُس نے مجھے جُھک کر سلام کیا۔ سارہ نے بھی سر کو خم کیا اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ میں نے مُنہ پھیر لیا۔

دوستو، پانچ چھ دن تک میری یہودن مجھے یاد آتی رہی۔ گرشیل میرے پاس نہیں آیا، نہ کمپ ہی میں کسی کو دکھائی دیا۔ رات کو مجھے اچھی طرح نیند نہ آتی تھی، کسی کی آبدیدہ کالی آنکھیں اور گھنی لمبی پلکیں میری نگاہوں میں پھرتی رہتی تھیں۔ میرے ہونٹ اس کے سیب جیسے چکنے اور تروتازہ گالوں کی لذّت نہ بھولتے تھے۔ کچھ فاصلہ پر ایک گاؤں تھا، وہاں ایک مہم کے ہمراہ فراہمی رسد کے لئے مجھے بھیجا گیا۔

میرے سپاہی گھروں میں گھس کر سامان لُوٹنے میں مشغول تھے۔ میں بازار میں ٹھہر گیا تھا اور گھوڑے ہی پر سوار تھا۔ دفعتہً کسی نے میری رکاب پکڑ لی۔

سارہ! تم کہاں؟

اس کے مُنہ پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور گھبرائی ہوئی تھی۔

حضور، ہماری داد کو پہونچئے، ہمیں بچایئے، آپ کے سپاہی ہماری توہین کر رہے ہیں، حضور ......،

اب اس نے مجھے پہچانا۔ اس کے چہرہ پر ہلکی سی سُرخی دوڑ گئی۔

کیا خوب! تم یہاں رہتی ہو؟

ہاں!

کہاں؟

سارہ نے ایک چھوٹے سے کہنہ مکان کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اس طرف کو بگٹٹ اُڑا لے گیا۔ مکان کی تنگ انگنائی میں ایک بدقوارہ فرتوت یہودن میرے قدآور سارجنٹ سلیافکا کے ہاتھوں سے تین مُرغیاں اور ایک بط چھیننے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے اپنے مال غنیمت کو سر سے اونچا کر رکھا تھا اور ہنس رہا تھا۔ مُرغیاں قیں قیں اور بط ٹاں ٹاں کر رہی تھی۔ دو اور سوار اپنے گھوڑوں پر گھاس چارہ اور آٹے کی بوریاں لا رہے تھے۔ مکان کے اندر سے کسی کے چیخ چیخ کر بولنے اور گالیاں دینے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے اپنے آدمیوں کو للکار کر منع کیا کہ یہودیوں سے کوئی تعرض نہ کریں نہ اُن سے کوئی چیز چھینیں۔ سپاہیوں نے تعمیل کی۔ سارجنٹ

اپنی مادیان پر سوار ہو گیا اور میرے پیچھے پیچھے چلا۔ میں نے سارہ سے پوچھا۔

کہو، تم مجھسے راضی ہوئیں؟

وہ میری طرف دیکھکر مسکرانے لگی۔

تم اتنے دن کہاں رہیں؟

آنکھیں نیچی کرکے بولی۔ میں کل آپ کے پاس آؤں گی۔

رات کو؟

جی نہیں، صبح کو۔

یاد کرکے، کہیں دھوکہ دو۔

نہیں، نہیں دھوکہ نہ دوں گی۔

میں اُسے پرشوق نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ دن کی روشنی میں وہ اور بھی حسین معلوم ہوتی تھی۔ مجھے اب تک یاد ہے، اس کے چہرہ کا پختہ کہربائی رنگ اور اس کی کالی کالی لٹوں میں نیلگوں دھاریاں میرے دل میں کھبی جاتی تھیں۔ میں نے زین پر سے جھک کر اس کے نازک ہاتھوں کو بڑی گرمجوشی سے دبایا۔

خدا حافظ، سارہ! خبردار، ضرور آنا۔

اچھا۔

وہ چلی گئی۔ میں نے سارجنٹ کو سواروں سمیت پیچھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور گھوڑے کی باگ اُٹھائی۔

دوسرے دن میں بہت سویرے اُٹھا۔ وردی پہنی اور خیمہ کے باہر آیا۔ صبح کا پُرفضا وقت تھا۔ سورج ابھی نکلا تھا اور گھاس کی ایک ایک پتی شبنم اور شفق کی سنہری روشنی میں چمک رہی تھی۔ میں ایک بلند دمدمے پر چڑھکر ایک سنگ انداز کے کنارہ پر بیٹھ گیا۔ میرے پاؤں میں ایک بھاری بھرکم آہنی توپ اپنی بھیانک گردن کھلے میدان کی طرف نکالے ہوئے جھانک رہی تھی۔ میں خالی الذہن بیٹھا ہوا ادھر اُدھر نظر دوڑا رہا تھا۔ یکایک کوئی سو قدم کے فاصلہ پر مجھے ایک کمرخمیدہ شخص دکھائی دیا جو خاکی لبادہ پہنے ہوئے تھا۔ وہ بہت دیر تک ایک ہی جگہ

چپ چاپ کھڑا رہا۔ پھر دفعتہً ایک سمت کو تھوڑی دُور تک دوڑا چلا گیا اور تیز تیز چوروں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھا۔

ایک گھٹنا ٹیک کر بیٹھ گیا۔ گردن بلند کرکے ہوشیاری کے ساتھ چاروں طرف دیکھا کان لگا کے سُنا میں اس کی حرکات کو بہت صفائی سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ بغل میں ڈال کر ایک کاغذ کا پرزہ اور پنسل نکالی اور اُس پر کچھ لکھنے یا لکیریں کھینچنے لگا۔ اس کا ہاتھ بار بار رُک جاتا تھا۔ خرگوش کی طرح چوکنّا ہو جاتا تھا۔ اپنے اردگرد کی ہر شے کا بہت تعمق کے ساتھ معائنہ کرتا تھا۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ ہمارے کیمپ کا خاکہ اُتار رہا ہے۔ کئی مرتبہ اس نے کاغذ کو چھپا چھپا لیا۔ آنکھیں آدھی بند کیں آدھی کھلی رکھیں۔ ہوا کی بُو سونگھی اور پھر اپنے کام میں محو ہو گیا۔ آخر کار یہودی گھاس پر پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ ایک پاؤں سے سلیپر نکالی اور وہ پرچہ کاغذ کا اس کے اندر ٹھونس دیا مگر ابھی سنبھل کر کھڑا نہ ہونے پایا تھا کہ دفعتہً اس سے دس قدم کے فاصلہ پر ایک پشتے کی آڑ سے میرے سارجنٹ سلیا فکا کا لمبی موچھوں والا چہرہ نمودار ہوا اور رفتہ رفتہ اس کا بھدّا جسم پورے کا پورا گویا زمین کے نیچے سے نکل آیا۔ یہودی اس کی طرف پیٹھ کئے کھڑا تھا۔ سلیا فکا ایک آن میں اس کے قریب آپہونچا اور اپنا بھاری پنجہ اس کی گردن پر جما دیا۔ گرشیل معلوم ہوتا کہ سُکڑ کر آدھا رہ گیا یا اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ چوب خشک کی طرح کانپ رہا تھا اور خرگوش کی سی نحیف چیخیں اس کے مُنہ سے نکل رہی تھیں۔ اب سلیا فکا نے اس کا گریبان پکڑ لیا اور دھمکا دھمکا کر خطاب کرنے لگا۔ میں اُن کی گفتگو تو نہیں سُن سکا مگر یہودی کے مایوسانہ اشاروں اور عاجزانہ تیوروں سے میں کچھ کچھ تاڑ گیا کہ صورت حال کیا ہے۔

یہودی دوبار سارجنٹ کے پاؤں پر گرا۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک فرسودہ سا رومال نکالا۔ گرہ کھولی اور اشرفیاں نکال کر سلیا فکا کو نذر دیں۔ سلیا فکا نے اس پیشکش کو بہت وقار کے ساتھ قبول کیا، مگر اس کا گریبان نہ چھوڑا اور اُسے برابر اپنی طرف گھسیٹتا رہا۔ گرشیل نے یکبارگی ایک جست لگائی اور چھڑا کر بھاگا۔ سارجنٹ بھی تعاقب میں جھپٹا۔ یہودی خوب تیزی سے دوڑ رہا تھا۔ بھاگنے میں اس کی نیلی جرابیں واقعی بڑی پھرتی کے ساتھ چمکتی ہوئی نظر آرہی تھیں مگر سلیا فکا نے تھوڑی دُور جا کر اسے پکڑ لیا اور گود میں اُٹھا کر سیدھا کیمپ کا رُخ کیا۔ میں دمدمے سے اُتر کر اس سے ملنے کو چلا۔ سلیا فکا مجھے دیکھتے ہی چلایا، آہا، حضور، میں ایک جاسوس کو آپ کی

خدمت میں لا رہا ہوں، جاسوس کو۔ ۔ ۔ گرانڈیل روسی پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔

یہودی بچے، باز آ، کیوں ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ ۔ ۔ ٹھہر تو سہی۔ ۔ ۔ ملعون۔ ۔ ۔ خبردار ہو جا، نہیں تو ٹینٹوا دبا دوں گا۔

بدقسمت گریشل اپنی کہنیاں سلیافکا کی پسلیوں میں چبھوئے دیتا تھا اور پیہم لاتیں چلا رہا تھا اور اس کی آنکھوں کی پتلیاں جلد جلد گردش کر رہی تھیں۔

کیا قصہ ہے؟ میں نے سلیافکا سے پوچھا۔

حضور، زحمت تو ہوگی، آپ ذرا اس کے دہنے پاؤں سے سلیپر اُتار لیں۔ میرا ہاتھ وہاں تک نہیں پہونچتا۔

وہ ابھی تک یہودی کو گود میں اُٹھائے ہوئے تھا۔ میں نے سلیپر اُتاری اور اس کے اندر سے احتیاط کے ساتھ لپٹا ہوا کاغذ نکالا، کھولا، اس پر صحیح صحیح نقشہ ہمارے کیمپ کا کھچا ہوا تھا۔ حاشیہ پر چند نوٹ درج تھے جو یہودی نے اپنی زبان میں بہت باریک لکھ رکھے تھے۔ اس اثنا میں سلیافکا نے گریشل کو زمین پر کھڑا کر دیا۔ یہودی نے آنکھیں کھولیں، مجھے دیکھا اور میرے پاؤں پر گر پڑا۔

کچھ کہے بغیر میں نے اُسے کاغذ دکھایا۔

یہ کیا چیز ہے؟

جی یہ، کچھ بھی نہیں حضور۔ ۔ ۔ میں تو صرف۔ ۔ ۔ اس کی زبان لڑکھڑانے لگی۔

کیا تم جاسوس ہو؟

وہ میرا مطلب نہیں سمجھا۔ اناپ شناپ بک رہا تھا اور میرے پاؤں کو دباتا جاتا تھا۔

تم جاسوس ہو؟

اس پر غشی کی حالت طاری تھی۔ اس نے سر ہلایا اور چیخ کر بولا، میں! ۔ ۔ ۔ ہرگز نہیں۔ کیسے ہو سکتا ہے، ناممکن۔ سراسر محال۔ پھر دبی زبان سے کہا، میں تیار ہوں۔ فوراً اسی دم۔ ۔ ۔ میرے پاس روپیہ موجود ہے۔ ابھی دیتا ہوں۔ یہ کہکر آنکھیں بند کر لیں۔

اس کی سیاہ ٹوپی پھسل کر گردن پر ڈھلک گئی تھی۔ اس کے سفید بالوں کی لٹیں بکھری ہوئی تھیں اور اوران سے پسینے کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ اس کے ہونٹ نیلے پڑ گئے تھے اور پھڑک رہے تھے۔ اس کی بھویں کھچ گئی تھیں اور چہرہ اُتر گیا تھا۔ سپاہی ہمارے گرد جمع ہو گئے۔ میں نے شروع میں یہ خیال کیا تھا کہ گرشیل کو قرار واقعی سرزنش کر کے چھوڑ دوں اور سلیا فکا سے کہہ دوں کہ خاموش رہے، مگر اب معاملہ فاش ہو گیا تھا اور حکام کے علم میں لائے بغیر چارہ نہ تھا۔

میں نے سارجنٹ سے کہا کہ اسے جرنیل صاحب کے پاس لیجاؤ۔

حضور، حضور، یہودی مایوس ہو کر چلانے لگا۔ حضور، میں بے گناہ ہوں۔ اس سے فرمایئے کہ مجھے چھوڑ دے، حضور، فرمایئے۔

سلیا فکا نے کہا، چلو آؤ، حضور جرنیل بہادر اس کا فیصلہ کریں گے۔

یہودی میری طرف مڑ کے چلایا، حضور، فرما دیجئے اس سے، رحم کیجئے۔ اس کی چیخوں سے میرے دل پر چوٹ سی لگتی تھی۔ میں نے اپنی رفتار اور تیز کر دی۔ ہمارا جرنیل ایک جرمن نژاد، متدین اور زندہ دل افسر تھا، مگر قانون جنگ کی پابندی میں بڑا سخت تھا۔ میں اس چھوٹے سے مکان میں گیا، جو عارضی طور پر اس کے لئے بنا یا گیا تھا اور چند الفاظ میں اپنے آنے کی وجہ بتائی۔ میں قواعد جنگ کی سختی سے آگاہ تھا اور اس لئے دوران گفتگو میں جاسوس کا لفظ تک زبان پر نہیں لایا۔ بلکہ تمام سرگزشت اس پیرایہ میں بیان کی گویا بالکل سرسری واقعہ ہے اور کسی توجہ کے قابل نہیں ہے، مگر گرشیل کی شومئی قسمت کہ جرنیل نے ادائے فرض کو رحم پر مقدم رکھا۔

وہ مجھسے اپنی ٹوٹی پھوٹی روسی زبان میں کہنے لگا، آپ ہو نوجوان، ناتجربہ کار، آپ کو ابھی جنگی معاملات کا تجربہ کہاں ؟ یہ معاملہ جس کی آپ ہم کو رپٹ دیا ہے، اہم ہے، بہت اہم۔ ہاں۔ ہاں وہ شخص کہاں ہے، جو ماخوذ ہوا، وہ یہودی ؟ کہاں ہے وہ ؟

میں نے باہر آکر یہودی کو اندر لیجانے کا حکم دیا۔ وہ لوگ اس شامت زدہ کو ہاتھوں ہاتھ لے گئے۔ بیچارہ مشکل سے کھڑا ہو سکتا تھا۔

جرنیل نے مجھسے مخاطب ہو کر پوچھا، ہاں، وہ نقشہ کہاں ہے جو اس شخص کے پاس سے برآمد ہوا؟
میں نے کاغذ اس کے حوالہ کیا۔ جرنیل نے اسے کھول کر الٹا پلٹا۔ اپنی نظر اس پر جما دی، اور ناک بھوں چڑھا کر بولا۔

یہ نہایت تعجب کی بات ہے۔ ۔ ۔ کس نے گرفتار کیا اس کو؟

سلیافکا نے جھٹ پکار کر کہا، میں نے حضور والا۔

خوب کیا، شاباش! جناب آپ اپنی صفائی میں کیا کہتے ہو؟

گرشیل نے بھرّائی ہوئی آواز میں جواب دیا، عالی۔ ۔ ۔ عالی۔ ۔ ۔ جناب۔ ۔ ۔ بالکل۔ ۔ عالیجناب میں بالکل بے قصور ہوں۔ ۔ ۔ یہ کارنٹ صاحب تشریف فرما ہیں، ان سے دریافت فرمایا جائے۔ میں تو ایک ایجنٹ ہوں۔ ۔ ۔ عالیجناب بالکل بے قصور، جرنیل نے سنجیدگی سے سر ہلاتے ہوئے دبی زبان سے کہا اس پر جرح کرنی چاہیئے۔ ۔ ۔ ہاں تو، جناب، آپ کیا اظہار دیتے ہو؟

میں بے قصور ہوں، عالیجناب میں بے قصور ہوں۔

مگر یہ تو خلاف قیاس کے ہے، تم۔ ۔ ۔ روسی زبان میں اس کو کیا کہتے ہیں۔ ۔ ۔ تم موقع واردات پر گرفتار کیئے گئے ہو۔ عین برسرِ موقع۔

سُنئے حضور، میں بے قصور ہوں۔

کیا تم یہ نقشہ کھینچا ہے تم دشمن کا جاسوس ہو؟

گرشیل گھبرا کر چلاّیا، نہیں حضور، میں نہیں۔

جرنیل نے سلیافکا کی طرف دیکھا۔

حضور والا، یہ جھوٹ بکتا ہے، خود کارنٹ صاحب نے اپنے ہاتھ سے نقشہ اس کی سلیپر کے اندر سے نکالا ہے۔

جرنیل نے مجھے دیکھا۔

ناچار سر کے اشارہ سے میں نے اس کی تصدیق کی۔

جناب من، تو آپ دشمن کا جاسوس ہو۔
خواس باختہ مجرم نے گڑگڑا کر کہا۔ میں نہیں، میں نہیں۔
جرنیل نے پوچھا، پہلے بھی تم اس قسم کا معلومات دشمن کو پہونچایا؟ اقبال کرو۔
میری کیا مجال تھی!
جناب من، آپ ہم کو دھوکہ ندو، آپ جاسوس ہو؟
یہودی نے آنکھیں بند کرلیں، سر جھکا لیا اور اپنی عبا کا دامن پھیلا دیا۔
تھوڑی دیر سکوت کرکے جرنیل نے واضح الفاظ میں حکم دیا۔
اس کو پھانسی دیدو۔ ۔ ۔ ایڈ فیوڈور شلیکل مان کہاں ہے؟
سپاہی شلیکل مان، جرنیل کے اڈجوٹنٹ کو بلانے کے لئے دوڑے۔ گرشیل کا چہرہ نیلگوں ہوگیا منہ کھل گیا، آنکھیں اُبل پڑیں۔
اڈجوٹنٹ حاضر ہوا۔ جرنیل نے اسے ضروری ہدایات دیئے۔ منشی آیا اور اپنی مدقوق چیچک زدہ صورت کی جھلکی دکھا کر اُلٹے پاؤں چلا گیا۔ دو تین افسروں نے متجسسانہ نگاہوں سے کمرہ کے اندر جھانک کر دیکھا۔
میں نے حتی الامکان بہت ہی شستہ جرمن میں جرنیل سے عرض کیا، حضور والا، کافی تنبیہ ہوچکی، اب اس کو رہا فرما دیجئے۔
اس نے رُوسی زبان میں مجھے جواب دیا، ہم ابھی کہہ رہا تھا، تم جوان آدمی ناتجربکار ہو اور لہٰذا براہ مہربانی تم خاموش رہو، ہم کو مت دق کرو۔
گرشیل چیخ مار کر جرنیل کے قدموں میں لوٹنے لگا۔
حضور عالی، رحم! رحم! میں پھر کبھی۔ ۔ حضور، میرے ایک بیوی ہے، ایک بیٹی ہے، حضور، رحم! رحم! ۔ ۔ ۔ واقعی حضور، مجھسے قصور ہوا۔ ۔ ۔ یہ پہلا وقت ہے، حضور، پہلا وقت ہے۔ یقین فرمایئے۔
تم اور کاغذات تو نہیں پہونچایا؟
پہلا وقت ہے، حضور، میری بیوی، میرے بچے۔ رحم! رحم!

مگر تم جاسوس ہو۔

میری بیوی، حضور، میرے بچّے۔

جرنیل کا دل اس کی فریاد سے کچھ پسیجا مگر افسوس کہ راہ گریز نہ تھی۔

اس نے دل پر جبر کر کے ایسے انداز میں جب کہ آدمی خلاف مرضی تشدّد سے کام لیتا ہے اور اپنے نرم جذبات کو فرضِ منصبی پہ قربان کر دیتا ہے کہا

قانون کے موافق اس عبرانی کو پھانسی دیدی جائے۔ لگا دو پھانسی۔ ۔فیوڈور کارلچ، مہربانی کر کے آپ اس واقعہ کی رپٹ مُرتّب کر دو۔

گرشیل کی حالت اب بالکل ہی غیر ہوگئی۔ بجائے اس معمولی خوف اور وحشت کے جو قوم یہود کا خاصہ ہے اس کے چہرہ پر وہ کیفیت طاری تھی جو اکثر نزع کے وقت دیکھنے میں آتی ہے۔ وہ پھندے میں پھنسے ہوئے وحشی جانور کی طرح تلملا رہا تھا۔ اس کا مُنہ کھلا ہوا تھا۔ اس کی گھگّی بندھ گئی تھی۔ وہ زمین پر پچھاڑیں کھاتا تھا اور چھاتی پیٹتا تھا۔ اس کے ایک ہی پاؤں میں سلیپر تھی، دوسری پہنانے کا کسی کو خیال نہ رہا تھا۔ عبا کے بند ٹوٹ گئے تھے اور ٹوپی گر پڑی تھی۔ ہم سب کے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ جرنیل حکم سنا کر خاموش ہوا تو میں نے پھر عرض کیا۔

حضور والا، بس اب معاف کر دیجئے۔

جرنیل نے چھوٹتے ہی جواب دیا، ہرگز نہیں، قانون کا پابندی لازم ہے، تاکہ دوسروں کو عبرت ہووے مگر اس کا لہجہ ہمدردی سے خالی نہ تھا۔

از راہ خدا ترسی۔

بگڑ کر بولا۔ مسٹر کارنٹ، مہربانی کر کے آپ اپنی جگہ پر جایئے اور تحکمانہ باہر جانے کا اشارہ کیا۔

میں سلام کر کے کمرہ سے نکل آیا۔ میں کسی خاص جگہ پر تو متعین تھا نہیں، جرنیل کی قیام گاہ سے تھوڑے فاصلہ پر ٹھہر گیا۔

دو منٹ کے بعد گرشیل برآمد ہوا۔ سلیا نکا اور تین سپاہی اس کو تھامے ہوئے تھے۔ یہودی کے حواس برجا نہ تھے اور بیچارہ کو پاؤں اُٹھانا دوبھر تھا۔

سلیانفکا میرے پاس سے گزر کر کیمپ میں گیا اور تھوڑی دیر کے بعد ہاتھ میں رسّی لئے ہوئے واپس آگیا۔ اس کا چہرہ سخت تھا مگر دل سخت نہ تھا اور اس وقت اس کے تیوروں سے ایک گونہ تاسف و دلسوزی ٹپک رہی تھی۔

رسی پر نظر پڑتے ہی یہودی کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ خاک پر بیٹھ کر جزع فزع کرنے لگا۔ سپاہی چپ چاپ اس کو گھیرے کھڑے تھے۔ ان کے چہرے اُداس تھے اور آنکھیں زمین پر لگی ہوئی تھیں۔ میں نے نزدیک پہونچکر گرشیل کو مخاطب کیا، جو دودھ پیتے بچّے کی طرح ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔ وہ میری طرف متوجہ نہیں ہوا۔ میں دست تاسف ملتا ہوا اپنے خیمے میں چلا آیا۔ ایک گدّے پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

دفعتہً کوئی شخص گھبراہٹ میں دوڑتا ہوا اندر آیا۔ میں نے سر اُٹھا کر دیکھا تو سارہ پر نظر پڑی۔ وہ اپنے آپ میں نہ تھی۔ وہ میرے قریب جھپٹ کر آئی اور میری آستین کھینچ کے بولی، میرے ساتھ چلو، میرے ساتھ چلو،

اس کی سانس پھول رہی تھی۔

کہاں ؟ کس واسطے ؟ یہیں بیٹھو۔

ابّا کے پاس، ابّا کے پاس، جلدی، اس کو بچاؤ، اس کو بچاؤ۔

ابّا ؟ کس کا ابّا ؟

میرا ابّا، اس کو پھانسی دے رہے ہیں۔

ہیں ! گرشیل تمہارا ۔۔۔۔۔۔۔

میرا باپ ہے، میں پھر کسی وقت آپ سے سب کہدوں گی۔ خدا کے لئے اُٹھئے، اُٹھئے، میرے ساتھ چلئے، اس نے یہ چند جملے ہاتھ مل مل کر بڑی یاس کے ساتھ ادا کئے۔

ہم دونوں خیمے سے نکل کر دوڑے۔ کھلے میدان میں ایک اونچے سے درخت کی طرف جاتے ہوئے ہمیں سپاہیوں کا ایک غول نظر آرہا تھا، سارہ نے کچھ کہے بغیر ان کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے سِٹ پٹا کر کہا، ٹھیرو، ہم کہاں دوڑے جا رہے ہیں ؟ سپاہی میرا کہا نہ مانیں گے۔

سارہ مجھے اسی طرح کھینچے لئے جا رہی تھی۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں۔ آسمان میری آنکھوں میں گھوم رہا تھا،

میں نے پھر کہا، سارہ، سنو تو سہی، یہاں دوڑتے پھرنے سے کیا حاصل ؟ بہتر یہ ہوگا کہ میں پھر جرنیل کے پاس جاؤں۔ آؤ ہم تم مل کر چلیں۔ شاید اُسے ترس آجائے۔

سارہ ایک دم ٹھٹک کر کھڑی ہوگئی اور دیوانوں کی طرح ٹکٹکی باندھکر میرے مُنہ کو تکنے لگی۔

سارہ خدارا سمجھو، میں کیا کہتا ہوں۔ میں تمہارے باپ کے لئے کچھ نہیں کرسکتا، ہاں جرنیل کو البتہ اختیار ہے۔ آؤ اس کے پاس چلیں۔

سارہ نے رو کے کہا، مگر اتنے ہم وہاں پہنچیں وہ اُسے پھانسی پر لٹکا دیں گے۔

میں نے ادھر اُدھر دیکھا، تھوڑی دُور پر منشی کھڑا ہوا تھا، میں نے اُسے پکار کر کہا، آیوان! مہربانی ہوگی، ذرا وہاں تک دوڑتے ہوئے جاؤ اور اُن سے کہو، میں جرنیل بہادر کے پاس سفارش کرنے گیا ہوں، تھوڑی دیر توقف کرو۔

بہت خوب، آیوان روانہ ہوگیا۔

ہم کو جرنیل کے حضور میں جانے کی اجازت نہیں ملی۔ میں نے بہت کچھ منت سماجت کی، قسمیں دلائیں مگر کوئی تدبیر نہ چلی۔ آخر سارہ نے اپنے بال کھول دیئے، سنتریوں کے قدم لئے مگر انھوں نے کسی طرح اندر نہ جانے دیا۔

سارہ نے دیوانہ وار اِدھر اُدھر نظر ڈالی۔ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا اور بے تحاشا میدان کی طرف دوڑی۔ میں بھی پیچھے پیچھے چلا۔ ہر شخص ہم کو حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔

ہم بھاگا بھاگ سپاہیوں کے پاس جا پہونچے۔ وہ حلقہ باندھے کھڑے تھے اور میرے دوستو، ذرا خیال کرنے کی بات ہے، سب کے سب بیچارے مُصیبت کے مارے گرشل کو دیکھ دیکھ کر ہنس رہے تھے مجھے غیظ آگیا اور اُن کو ڈانٹ کر منع کیا۔ یہودی نے ہم کو دیکھا اور اپنی بیٹی کے گلے میں باہیں ڈالدیں اور سارہ بیتاب ہوکر اس سے لپٹ گئی۔

غریب کو خیال ہُوا کہ شاید معافی مل گئی ہے اور میرا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا کہ میں نے مُنہ پھیر لیا۔ ہاتھ مل کے چلاّیا۔ حضور، مجھے معافی ملی، میں نے کچھ جواب نہ دیا۔

نہیں ؟

نہیں ۔

بسور کر کہنے لگا، دیکھیے حضور، اسے دیکھیے، یہ لڑکی ۔ ۔ ۔ آپ کو معلوم ہے ۔ ۔ ۔ یہ میری بیٹی ہے:

میں نے کہا، مجھے معلوم ہے، اور مُنہ پھیر لیا۔

بولا، حضور، میں خیمے سے زیادہ دُور نہیں گیا تھا۔ کسی طرح ۔ ۔ ۔ میرا یہ مطلب نہ ۔ ۔ ۔'

وہ کہتے کہتے رُک گیا اور لمحہ بھر کے لئے آنکھیں بند کر کے کہا، میں آپ سے بس روپیہ اینٹھنا چاہتا تھا حضور، میں اقرار کرتا ہوں ۔ ۔ ۔ مگر کچھ اور ۔ ۔ ۔' میں خاموش تھا۔ گرشل میری نظروں سے بالکل گر گیا اور وہ اس کی شریک کار تھی۔

پھر اُس نے دھیمی آواز سے رُک رُک کر کہا، اب اگر آپ مجھے بچا لیں ۔ ۔ ۔ میں اُسے حکم دیدونگا ۔ ۔ ۔ میں ۔ ۔ ۔ آپ سمجھے میرا مطلب ؟ ۔ ۔ ۔ ہر بات ۔ ۔ ۔ مجھے بالکل عذر نہ ۔ ۔ ۔'

وہ تھر تھر کانپ رہا تھا اور دہنے بائیں دیکھتا جاتا تھا۔ سارہ چُپ چاپ بے خودی کے عالم میں اس سے چمٹی ہوئی تھی۔ دفعتہً اڈجوٹنٹ نے آکر کہا، کارنٹ صاحب، حضور، جرنیل بہادر نے مجھے آپ کو حراست میں لینے کا حکم دیا ہے اور تم ۔ ۔ ۔'، اس نے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ یہودی کو ۔ ۔ ۔ فوراً۔ سلیا فکا یہودی کی قریب آیا:

میں نے اڈجوٹنٹ سے کہا، فیوڈور کارپچ (اس کے ہمراہ پانچ سپاہی آئے تھے) کم سے کم ان سے کہکر بیچاری لڑکی کو تو یہاں سے الگ کردو۔'

البتہ، ضرور۔

ناشاد لڑکی اپنے حواس میں نہ تھی۔ گرشل یہودی زبان میں اس سے کچھ سرگوشی کر رہا تھا۔ سپاہیوں نے بمشکل تمام سارہ کو باپ کی آغوش سے چھڑایا اور اُٹھا کر لے چلے۔ بیس قدم بھی نہ گئے تھے کہ وہ دفعتہً ان کی گرفت سے تڑپ کر نکل آئی اور گرشیل کی طرف دوڑی ۔ ۔ ۔ سلیا فکا نے اسے روکنا چاہا۔ سارہ نے اس کو ایک طرف دھکیل دیا۔ اس کا چہرہ لال ہو گیا، اس کی آنکھیں چمکنے لگیں، اس نے آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھائے اور جرمن زبان میں یوں چیخ چیخ کے کوسنا شروع کیا :-

تم پر خدا کی مار ہو! تمہارا ستیاناس جائے۔ لعنت ہو تم پر، تمہاری سات پشت پر خدا کی اور خدا کے ولیوں کی، تمہاری نسل قطع ہو جائے، تم فاقے کر کے مرو۔ تم ایڑیاں رگڑ کے مرو، تم کتے کی موت مرو اللہ رے، بیر حمو! اللہ رے، خونخوارو! زمین تم کو نگل لے، آسمان تم پر پھٹ پڑے، اس کی گردن پیچھے کو ڈھلک گئی اور وہ تیورا کر زمین پر گر پڑی۔ سپاہی اسے اٹھا لے گئے۔

سپاہیوں نے گرشیل کے ہاتھ باندھ دیئے۔ مجھے اب معلوم ہوا کہ جس وقت میں سارہ کے ساتھ کیمپ سے دوڑتا ہوا آیا تھا، یہ لوگ یہودی پر کیوں ہنس رہے تھے۔ باوجودیکہ موقع ایسا عبرتناک تھا مگر اس کی حالت نہایت ہی مضحکہ خیز تھی۔ دنیا سے، بیوی بچوں سے، عزیز و اقربا سے، جدا ہونے کے قلق میں اس سے کچھ ایسے مضحک اشارے، بھیانک آوازیں اور عجیب و غریب حرکتیں سرزد ہو رہی تھیں کہ اس کو دیکھ کر ہنسی ضبط کرنا دشوار تھا۔ اگرچہ، موقع، عام لوگوں ہی کے لئے ہی نہیں، بلکہ ہم سپاہیوں کے لئے بھی دردانگیز، نہایت ہی دردانگیز تھا۔ کمبخت کی جان مارے خوف کے ہونٹوں پر آگئی تھی۔ زبان پر فریاد جاری تھی، ہائے! ہائے! ہائے! ٹھیرو، ارے ٹھیرو۔ مجھے کچھ کہنا ہے، بہت کچھ کہنا ہے۔۔ نائب سارجنٹ صاحب، آپ تو مجھ سے واقف ہیں! میں ایک ایجنٹ ہوں، بے گناہ ایجنٹ۔ مجھے کیوں پکڑ رکھا ہے؟ ٹھیرو، منٹ بھر ٹھیرو، ارے آدھا منٹ، پاؤ منٹ، ٹھیرو، جانے دو۔ میں تو غریب یہودی ہوں۔ سارہ؟ د۔۔ ارے، سارہ کہاں ہے؟ ہاں، مجھے خبر ہے، وہ کوئر لفٹنٹ صاحب کے خیمے میں ہے (خدا جانے مجھکو یہ نوساختہ خطاب عطا کرنے سے اس کا کیا مطلب تھا) حضور، کوئر لفٹنٹ صاحب میں خیمے کے پاس موجود ہوں۔

(سپاہی گرشیل کو مضبوط پکڑے ہوئے تھے۔۔ اس نے زور سے ایک چیخ ماری اور تڑپ کر ان کے ہاتھوں سے نکل گیا)

حضور عالی، رحم کرو! مصیبت کا مارا ہوں، بال بچوں والا ہوں۔ میں آپ کو دس اشرفیاں دیتا ہوں، پندرہ دیتا ہوں۔۔ حضور عالی۔۔ سپاہی اسے درخت کے قریب کھینچ لے گئے۔

چھوڑ دو، رحم کرو، حضور، لفٹنٹ صاحب! حضور، جرنیل صاحب! کمیدان صاحب! آخر انہوں

نے اس کی گردن میں پھندا ڈال ہی دیا۔

میں نے آنکھیں بند کرلیں اور وہاں سے بھاگا۔

میں دو ہفتہ تک زیر حراست رہا۔ مجھے خبر ملی کہ بدنصیب گرشل کی بیوہ اس کے کپڑے لینے کے لئے آئی تھی۔ جرنیل نے اُسے سو روبل دلوائے۔ سارہ کو میں نے پھر کبھی نہیں دیکھا۔ میں لڑائی میں زخمی ہوگیا اور ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ میرے اچھا ہونے کے تک ہی ڈونزگ نے پھاٹک کھول دیئے اور میں اپنی رجمنٹ متعینہ رہائن میں جا شامل ہوا۔

تبصرہ

اُردو کے جدید مطبوعات

ادب

قزاق (مترجمہ و مولفہ جناب محمد عمر صاحب بی اے و نور الٰہی صاحب بی اے قیمت (۸/) شیخ مبارک علی تاجر کتب، لاہوری دروازہ - لاہور)

ہم اس سے قبل اس امر کی اطلاع دے چکے ہیں کہ اِن دونوں صاحبوں نے یہ تہیہ کیا ہے کہ دُنیا کے مشہور اور اعلیٰ ڈراموں کا ترجمہ اُردو زبان میں کریں اور یہ بہت خوشی کی بات ہی کہ وہ بڑے سرعت سے اپنے ارادے کو پُورا کر رہے ہیں۔ اِس سے پہلے "روح سیاست" اور "جان ظرافت" دو ڈرامے شائع ہو چکے ہیں اور اب یہ تیسرا ڈراما ہی۔ یہ جرمن کے نامور فلسفی شاعر اور ڈراما نگار شِلر کے مشہور اور زبردست ڈرامے کا ترجمہ ہی۔ اسے محض ترجمہ کہنا ناانصافی ہی، یہ ترجمہ اور تالیف دونوں ہی۔

قابل مترجمین کا شروع سے یہ خیال ہی کہ اِن ڈراموں کا کامل ترجمہ زیادہ سودمند نہیں بلکہ اہل ملک کے ذوق اور ملکی ناٹک کے حالات کے روسے اِس میں مناسب تصرف کی ضرورت ہی تاکہ پڑھنے والوں اور ناٹک دیکھنے والوں کی دلچسپی بڑھے اور ایسے حالات اور خیالات کے دیکھنے اور سننے سے الجھن میں نہ پڑیں جن سے وہ مانوس نہیں۔ ایک حد تک تو مجھے اِس خیال سے اتفاق ہی یعنی ملکی تھیٹر کی ضروریات کی خاطر تصرف جائز ہی کیوں کہ بعض اوقات ڈرامے محض پڑھنے کے لئے لکھے جاتے ہیں اور اسٹیج کے لئے ان میں کتر بیونت کرنی پڑتی ہی۔ مطالعہ کی حالت بالکل جُدا ہی اور جب وہی تھیٹر کے اسٹیج پر آتا ہی تو اس کا رنگ اور ہوتا ہی۔ وہاں اصل زندگی کی ہو بہو نقل کرنی پڑتی ہی بلکہ نقل کو اصل کر دکھانا مقصود ہوتا ہے، اور پھر اس کے ساتھ اُن شرائط

اور قیود کی پابندی بھی کرنی پڑتی ہے جو تھیٹر کے ساتھ وابستہ ہیں۔ مثال کے طور پر قزاق ہی کو لیجئے۔ اصل ڈراما مطالعہ کے لئے بے مثل اور عجیب کتاب ہی اور اسی لئے جرمن زبان میں بھی تھیٹر کی خاطر تصرّف کر کے نیا اڈیشن تیار کرنا پڑا۔ نور عمر صاحبان (یعنی محمد عمر صاحب و نور الٰہی صاحب) نے بھی اُردو کے دو اڈیشن تیار کئے ہیں ایک عام مطالعہ لئے اور دوسرا تھیٹر کے واسطے کیا اچھّا ہوتا اگر عام مطالعہ کے لئے تمام وکمال ڈراما کا ترجمہ کر دیا جاتا۔ کیوں کہ اِس میں تمدنی حالات وخصوصیات کی وہ نزاکتیں نہیں ہیں جن کی وجہ سے پڑھنے والے کو اُلجھن پیدا ہو۔ اِس کا تعلق زمانہ وسطیٰ سے ہی جس کا تمدّن ہر جگہ تقریباً یکساں تھا اور اردو خواں طبقہ اُسے بڑے ذوق سے پڑھتا اور مستفید ہوتا۔ تصرّف اور ایجاز سے مصنف کے تخیل کی بلند پروازی اس کے پر زور خلاقی خیالات اور حکیمانہ نکات اور زورِ قلم کا بہت سا حصہّ حذف ہو گیا ہی۔ دوسرا تصرّف قابل مؤلفین نے یہ کیا ہی کہ اصل ڈراما ٹریجڈی (المیہ) تھا، انھوں نے اسے کامیڈی (بزمیہ) کر دیا ہی۔ لیکن اس تصرّف میں انھوں نے بڑے سلیقے سے کام لیا ہی۔ اِن تصرّفات سے انھوں نے جرمن ڈراما کو ہندوستانی ناٹک بنا دیا ہی۔ یہاں تک کہ نام بھی بدل دیئے ہیں۔

با وجود اِن تصرفات کے ان کی یہ کوشش قابلِ تعریف اور لایقِ داد ہی۔ اِس ڈراما کی زبان پہلے دو ڈراموں کے مقابلہ میں زیادہ فصیح زیادہ شاندار ہی اور اصل مصنف کے خیالات (جہاں تک اِس میں باقی ہیں) اور زورِ قلم بڑے حُسن وخوبی سے ادا کیا ہی۔ یہ ڈراما درحقیقت ایک اخلاقی اور مذہبی ڈراما ہی۔ اور بعض خاص کیرکٹر جن پر ڈرامے کا دارومدار ہی، اُن کے خیالات اور دلی جذبات، اُن کی کمزوری اور قوّت کی تصویر اس حسن وخوبی کے ساتھ کھینچی ہی کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہی۔ باپ کی محبت اور اِس محبت کی کمزوری عجیب وغریب ہی۔ بڑا بیٹا حالات وزمانہ کی نامساعدت اور مایوسی سے گھبرا کر قزاقوں میں جا ملتا اور اُن کا سردار ہو جاتا ہی۔ باپ کو اس کا حال معلوم نہیں مگر چھوٹا بیٹا کمینہ سازشوں اور بدطینتی سے باپ کو بڑے بھائی سے برگشتہ کر دیتا ہی اور فریب سے اِس کی موت کا یقین دلاتا ہے۔ باپ بیٹے کی محبّت میں بیقرار ہی، زندگی دو بھر ہے۔ چھوٹا بیٹا اگرچہ اس عیاری سے وارث ہو جاتا ہی مگر جب تک باپ زندہ ہی مال و دولت پر قابض نہیں ہو سکتا۔ اِس لئے وہ باپ کو حقیقی معنوں میں زندہ درگور کر دیتا ہے۔ یعنی ایک قسم کے چاہ سلیمان میں قید رکھتا ہی۔ ابھی مرنے نہیں پاتا کہ قزاق کر جو درحقیقت بڑا

بیٹا ہے) ہاتھوں قید سے مخلصی پاتا ہے لیکن جب اُسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹے بیٹے پر انتقام کی آنچ آنے والی ہی تو وہ بیقرار ہو کر تڑپنے لگتا ہی اور نہایت لجاجت سے رحم کی التجا کرتا ہے۔ جب اُس سے یہ کہا جاتا ہی کہ ایسا نالایق بیٹا۔ رحم کا مستحق نہیں تو وہ کس محبت سے کہتا ہی کہ "نالایق بیٹا، پھر بھی میرا بیٹا ہی" قزاق اگرچہ بری صحبت میں ہی۔ ڈاکوؤں لیٹروں کا سردار ہے مگر اس کے دل میں شرافت کا نور ابھی باقی ہے وہ باوجود اس ناشائستہ صحبت کے مظلوموں کی حمایت کرتا اور ظالموں کو اُن کے اعمال کی سزا دیتا ہی۔ وہ اُس قانون کی جو مظلوموں اور بیکسوں کو کچلے اور دلے ڈالتا ہی، علانیہ مخالفت کرتا ہے اور قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر دنیا کی چول ٹھیک ٹھیک بٹھانا چاہتا ہی۔ لیکن قزاق آخر قزاق ہے۔ ایک خاطی کی سزا کے لئے بیسیوں بے گناہ مارے جاتے ہیں، ایک مظلوم کے انتقام کے لئے بیسیوں معصوموں کا خون ہوجاتا ہے۔ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہی۔ آخر میں متنبہ ہوتا ہی۔ چھوٹے بھائی کی بدطینتی، کمینہ سازشیں، بیدردی اور بے رحمی، قزاق کی شرافت کو اور نمایاں کردیتی ہیں۔ بُرائی کو حقیقی رنگ میں دکھانا نیکی کی خدمت ہی۔ جمیلہ (ایمیلیا) ان کی چچازاد بہن ہی۔ بڑے بیٹے یعنی قزاق پر عاشق ہے۔ چھوٹا بیٹا جب امارت حاصل کرلیتا ہے تو یہ اُس کی دست نگر اور محتاج ہوجاتی ہی اور وہ اپنی حکومت اور دباؤ سے چاہتا ہی کہ جمیلہ کو اپنے قبضے میں لے آئے۔ مگر اس کی محبت ایسی سچی اور مستقل ہی کہ وہ اس کی امارت اور حکومت کی مطلق پرواہ نہیں کرتی۔ یہ تمام کیریکٹر ایسی خوبی سے بیان کئے گئے ہیں کہ پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

اصل ڈراما نہایت ہی ہولناک ٹریجڈی ہے۔ اُس اڈیشن میں جو تھیٹر کے لئے تیار کیا گیا تھا، اسے بہت کچھ نرم کر دیا ہی لیکن ہمارے مترجم مؤلفین نے انجام کو بالکل بدل کر اُسے اچھی خاصی کامیڈی (بزمیہ) بنا دیا ہی آخر میں میں ان دونوں صاحبوں سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ آیندہ جب دوبارہ طبع کی نوبت آئے تو اس ڈراما کا تمام و کمال ترجمہ اُردو میں کردیں اور میں اُنھیں یقین دلاتا ہوں کہ اُن کے ترجمہ کی ضرور قدر ہوگی۔ میرے بار بار اصرار کرنے کا مقصد یہ ہی کہ میں چاہتا ہوں کہ دنیا کے بہترین ڈراموں کے کامل اور صحیح ترجمے اہلِ وطن کے سامنے پیش کئے جائیں تاکہ وہ صحیح طور پر اندازہ کرسکیں کہ ڈراما کسے کہتے ہیں اور ممکن ہی کہ اُن میں جو جوہر قابل ہیں وہ اپنی زبان میں ویسے یا اُن سے بہتر ڈرامے تصنیف کرسکیں۔ اگر ہم اپنے ترجموں کی بدولت ایک آدھ شخص بھی

ایسا پیدا کرسکیں تو اُردو ادب پر کیا کم احسان ہوگا؟ بخصوصاً یہ زمانہ ڈرامے کے لئے بہت موزوں ہے ملک میں انقلابی حالت پیدا ہوگئی ہے، خیالات میں ہیجان اور دل و دماغ میں حرکت دکھائی دیتی ہے، سیاسی، معاشرتی اور تعلیمی حالت میں تغیر عظیم پیدا ہوگیا ہے اور جدھر نگاہ اُٹھائیے ڈرامے کے لئے اچھا خاصا سامان نظر آتا ہے۔ حالات و واقعات پکارے کہہ رہے ہیں کہ بس ایک جادو نگار قلم اور بلند خیال دماغ کی ضرورت ہے۔

خنجر ہلال - یہ ایک تاریخی ڈراما ہے جو منشی غلام قادر صاحب فرخ امرتسری نے ترکوں کے معاملاتِ حال پر لکھا ہے۔ اس میں محاربۂ عظیم یورپ کے بعد ٹرکی کی بے بسی، اتحادیوں کی ریشہ دوانیاں، یونانیوں کی دست برد، ترکوں کی احیا اور کامیابی کا مرقع کھینچا ہے۔ ڈرامے کے لئے مضمون بہت اچھا ہاتھ آیا ہے، فرخ صاحب مشاق شاعر اور ناثر ہیں۔ چنانچہ اس ڈرامے میں اُن کی نظم و نثر اس کی شاہد ہے۔ اُردو میں ڈرامانویسی کا فن نہایت پست حالت میں ہے۔ اس وقت یہ آخری ڈراما ہے جو اُردو میں لکھا گیا ہے ترجمہ نہیں، غیر زبان کے کسی ڈرامے سے ماخوذ نہیں، بلکہ فرخ صاحب کی اپنی تصنیف ہے۔ لیکن اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک اردو ادب کے اس شعبۂ لطیف نے کوئی ترقی نہیں کی۔ ڈرامے میں اصل چیز کیرکٹر ہے۔ خاص اشخاصِ ڈراما کی خصوصیات اس خوبی سے بیان کی جاتی ہیں کہ وہ زندہ اور جیتے جاگتے نظر آتے ہیں۔ یہ ڈرامانویس کا خاص کمال ہے کہ جوں جوں ڈراما ترقی کرتا جاتا ہے یہ خصوصیات بھی ساتھ ساتھ نمایاں ہوتی جاتی ہیں۔ چنانچہ بعض مشہور ڈراموں کے کیرکٹر تاریخی مشاہیر سے بھی زیادہ معروف اور مقبول ہیں۔ خنجر ہلال میں یہ بات بالکل مفقود ہے اس کے اشخاص بالکل بے جان معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ غازی مصطفےٰ کمال جو اس ڈرامے کے خاص کیرکٹر ہیں وہ بھی بے رنگ نظر آتے ہیں ہم چوں کہ روزانہ اخبارات اور رسالات پڑھتے رہتے ہیں اس وجہ سے پہلے سے ہمارے دل میں اُن کی بے انتہا وقعت ہے ورنہ اگر کوئی نیا شخص اس ڈرامے کو پڑھے تو کبھی اس کے دل میں وہ حرمت و وقعت پیدا نہیں ہوسکتی اس ڈرامے میں بہت اچھا موقع تھا کہ قابل مصنف اُن کے کمالات اور خصوصیات کو رفتہ رفتہ اُبھارتے اور ترقی دیتے۔ مجھے اس میں بھی شبہ ہے کہ یہ ڈراما بغیر کمی بیشی اور کاٹ چھانٹ کے اسٹیج پر بھی کامیاب ہوسکتا ہے یا نہیں بعض سین غیر دلچسپ اور بے جوڑ معلوم ہوتے ہیں۔ اس بات کا خیال نہیں رکھا گیا کہ کون سی باتیں ترک کر دینی چاہئیں اور کون سی نمایاں کرکے دکھانی چاہئیں۔ شاعر اور خاص کر ڈرامانویس کا بڑا کمال یہی ہے کہ وہ سب کچھ

دیکھتا ہے مگر اس کی نظر وہی چیز انتخاب کرتی ہے جو سارے معاملے کی جان ہی۔ انھیں وجوہ سے میں نے "قزاق" کے تبصرے میں اعلیٰ درجے کے ڈراموں کے بے کم وکاست ترجمہ کی ضرورت خیال کی ہی۔

ڈرامے کی شروع میں دو تصویریں بھی ہیں۔ ایک غازی مصطفےٰ کمال کی اور دوسرے جس میں غازی موصوف اور اُن کے وزرائے حکومت ہیں۔ یہ دونوں تصویریں اس قدر خراب ہیں کہ اگر نہ ہوتیں تو اچھا ہوتا چھپائی اور کاغذ بھی بہت معمولی ہی۔ قیمت (عہ) مینجر صاحب دارالاشاعت امرت سر سے مل سکتا ہی۔

زندۂ جاوید۔ یہ نظم سیدہ انیس الفاطمہ بیگم صاحبہ (مسز محمود) کی تصنیف ہی جس میں مُصنّفہ نے امام حسینؓ کی شہادت کا واقعہ بیان کرکے اُسے موجودہ حالات سے مطابق کیا ہے اور اُسی ایثار و صداقت کی ترغیب دی ہی۔ کاش ہماری مرثیہ گو شاعر رونے رُلانے کے بجائے اِس عظیم الشان اور بے مثل سانحہ سے اخلاقی کام لیتے۔ اگرچہ یہ نظم اعلیٰ درجہ کی نہیں ہے تاہم قابل مصنفہ قابل شکرگذاری ہیں کہ انھوں نے قوم کے اُبھارنے کے لئے اپنی شاعری سے ایسا مفید کام لیا۔ شروع میں آٹھ صفحہ کا ایک مقدمہ بھی ہے اِس کتاب کا کُل منافع مُصیبت زدگان اناطولیہ کے امدادی سرمایہ میں داخل کیا جائے گا۔ گویا اس کا خریدنا اور پڑھنا ایک پنتھ دو کاج ہی (چھوٹی تقطیع تعداد صفحات ۲۴ قیمت (۵؍) ذیل کے پتہ سے مل سکتی ہی۔

سیدہ انیس الفاطمہ بیگم صاحبہ۔ مکان حاجی مولوی علی بخش صاحب مرحوم محلہ مسلح پور ڈاکخانہ مہندرو۔ پٹنہ (عظیم آباد)

درسِ عمل۔ یہ مولوی محمد حسین صاحب محوی صدیقی لکھنوی کے چند نظموں کا مجموعہ ہی جو دائرۂ ادبیہ لکھنؤ نے شائع کیا ہی۔ اس میں کل دس نظمیں ہیں جن کے عنوان یہ ہیں۔ نوائے درد، نوائے ملّت، نالۂ غم، سروشِ عالم صلائے عمل، فغانِ دل، حامیانِ قوم سے خطاب، فریادِ معصوم (ایک یتیم موپلا بچے کی زبان سے) جوانِ ترک، اِن ناموں سے نظموں کی کیفیت عیاں ہی۔ یہ سب کی سب نظم کی اُس قسم میں سے ہیں جو ہمارے ہاں قومی نظم کہلاتی ہی۔ محوی صاحب کی نظم و نثر سے اہلِ زبان ناواقف نہیں اور اس لئے کسی تعارف کی ضرورت نہیں۔ کتاب چھوٹی تقطیع پر اچھی چھپی ہی۔ قیمت (۴؍) ہے۔

جوئے شیریں (مطبع انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ)

محمود شاہ خاں صاحب بی اے ال ال بی کی فرہادوار کوشش کا نتیجہ ہے۔ یعنی ایک ہی نظم (اور پھر نثر)

میں سے الگ الگ چار نظمیں تراشی ہیں جس کا نمونہ ذیل میں درج ہے:-

یادِ خدا کی دل سے کر پھیر نہ منہ اِدھر اُدھر — عمر کر اس طرح بسر جیسے کسی کا ہو سفر

دہر کی ہے ہوا یہی رسم جہاں بھی ہے یہی — جشن میں دل کہیں لگا اور کہیں ہے چشم تر

دستِ قضا نے مجھکو جب رہروِ زندگی کیا — مایۂ لذتِ فنا دل کے لئے بنی سپر

آگ لگا کے شوق کی کس نے دلِ خراب میں — پھونک دیا کلیم کا ایک ہی آنچ میں جگر

عیش پہ خاک ڈال کر بامِ فلک کی سیر ہو — آج یہ افسوں گری اے دلِ ناصبور کر

باغِ وفا میں دیکھا آ کر کے نثار جان و دل — وعدۂ وصل پر نہ جا مان یہ قولِ معتبر

شاخِ نہال آرزو خشک ہی انتظار میں — بادِ سحر کو یہ خبر دے کہیں جا کے نامہ بر

عہدِ قلم و الست بھول گیا ہر ایک مست — حیف کہ دل سا راز دار وہ بھی خطا کری اگر

دیکھئے یہ ادا نئی دلبرِ بے نیاز کی — پھول کو خود گرا دیا صحنِ چمن میں توڑ کر

ان دس شعروں میں جن الفاظ پر ہم نے نشان ۱ بنا دیا ہے ان کو جمع کرنے سے پہلی مثنوی کا پہلا مصرعہ پیدا ہوگا۔ ع

"یاد ہے لذتِ پیمانِ الست"

نشان ۲ کے الفاظ جمع کرنے سے دوسری مثنوی کا پہلا مصرعہ بن جائے گا۔ ع

"دہر میں کی کس نے یہ افسوں گری"

اسی طرح ۳ اور ۴ کے تحت میں جو الفاظ یا جزو الفاظ آئے ہیں ان کو یکجا کرنے سے دو مصرعے تیار ہو جائیں گے

(۱) کسی نے مجھکو کل آ کر خبر دی — اور

(۲) اے مایۂ عیشِ جاودانی

اسی طور پر ایک ہی نظم سے چاروں مثنویوں کے مصرعے نکلتے چلے آتے ہیں۔ آگے جا کر نظم کے بجائے نثر کی عبارت آگئی ہی اور پھر ایک دوسری نظم اور نثر ہے لیکن وہ چاروں مثنویاں اسی طریق پر مرتب ہوتی چلی جاتی ہیں جس کا نمونہ اوپر پیش کیا گیا ہی۔

اِس دشوار اہتمام سے نظم اور مثنویوں میں کہیں کہیں بہت تکلف پیدا ہوگیا ہی جس کا خود فاضل مصنف کو اعتراف ہی۔ نیز معنوی اعتبار سے بعض شعر (خاص کر چوتھی مثنوی کے) بالکل خلاف محل اور محض قافیہ پیمائی نظر آتے ہیں۔ بایں ہمہ یہ جدید اور لطیف صنعت مصنف کی ذہانت و قدرتِ شعر گوئی کا بہترین ثبوت ہی اور اِسی لئے ہمیں ان سے یہ شکایت کرنے کا حق ہی کہ وہ اپنی ان خداداد قوتوں سے کوئی اور مفید کام کیوں نہیں لیتے کہ اُنھیں اِس قسم کی "سنگ تراشی" بلکہ کوہ کنی میں صرف کر رہے ہیں جس میں اعجوبیت کے سوا اور کوئی خاص خوبی نہیں ہی۔

سفرنامہ

۱۔ مشرقی ترکستان (دائرہ ادبیہ لکھنؤ۔ قیمت ۴؍)

سر اوریل اسٹائن مشہور سیاح وسط ایشیا جب دوسرے سفر سے واپس ہوئے تو انھوں نے رائل جغرافیکل سوسائٹی لندن میں اپنی سیاحت اور تحقیقات کے متعلق ایک لکچر دیا۔ اور اپنے ایران و ہندوستان و افغانستان و ترکستان کے اُن دوستوں کے لئے جو انگریزی نہیں جانتے فارسی میں ترجمہ کرایا۔ اِس فارسی ترجمہ سے سید محمود اعظم فہمی صاحب نے اردو میں ترجمہ کیا۔ سر اوریل کا اصل سیاحت نامہ دو ضخیم جلدوں میں ہی۔ یہ لکچر انھوں نے ۱۹۰۹ء میں دیا تھا۔ اِس کا ترجمہ اب اردو میں چھپا ہی جب کہ تیسرے سیاحت سے بھی وہ کامیاب اور مالا مال ہو کر واپس آچکے ہیں۔ کیا اچھا ہوتا اگر اُس تیسری سیاحت کی بھی مختصر سی کیفیت اس کے آخر میں درج کی جاتی۔ وہ اس پر بھی کئی لکچر دے چکے ہیں۔ تاہم اِس کے پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ یہ پیر جواں ہمت کیسے کیسے خطرناک اور دشوار گزار مقامات پر پہونچا ہے جہاں آدمی کا جانا ممکن نہیں معلوم ہوتا اور وہاں سے کس قدر غیر معمولی محنت و مشقت کے بعد آثار قدیمہ کی وہ لازوال دولت لے کر آیا جو صدہا سال سے انسان کی آنکھوں سے پوشیدہ تھی۔ اس نے قدیم کتابوں اور قدیم صنعتوں اور تحریروں اور عجائبات کے سَو اونٹ لاد کر بھیجے اور یہ سب چیزیں اُس نے صحرائے لق و دق میں سے کھود کھود کر نکالیں یا ایسے خفیہ مقامات سے ڈھونڈھ کر نکالیں جن کا پتہ کسی کو نہ تھا۔ اِس شخص کی حیرت انگیز ہمت و استقلال خطرات اور دشواریوں سے صابرانہ مقابلہ

اپنے مقصد کی دھن نہایت قابلِ تعریف اور سبق آموز ہی۔

۲- سیاحت ہوا (دائرۂ ادبیہ لکھنؤ۔ قیمت ۸؍)

"سیاحتِ زمین" کے طرز پر یہ دوسرا ناول بھی دائرۂ ادبیہ لکھنؤ نے انگریزی سے ترجمہ کرا کے شائع کیا ہی اور اس میں بھی قصّے کے پیرائے میں ہوائی جہازوں کے متعلّق بہت کچھ معلومات جمع کی ہی اور اگرچہ اس سے اصلی فائدہ یورپ و امریکہ والے ہی اُٹھا سکتے ہیں پھر بھی اہلِ ہند کے لئے ایسی کتابیں دلچسپی سے خالی نہیں لیکن کتاب کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ اصل فرانسیسی ناول میں بائیس سال پہلے لکھا گیا تھا اور اسی لئے اس میں فنِ پرواز کے متعلق بعض ایسے پرانے مباحث پائے جاتے ہیں جنھیں علمی دُنیا طے کر چکی اور جنھیں ایسی شدّومد کے ساتھ تازہ کرنے کا اب کوئی موقع نہیں ہی۔

قابل مترجم نے کتاب میں کہیں کہیں جغرافی اور تاریخی حواشی لکھنے میں کافی محنت و دردسری اُٹھائی ہے لیکن ہمارے خیال میں بہتر ہوتا کہ وہ اتنا وقت خود ترجمے کو زیادہ صاف و سہل بنانے میں صرف کرتے۔ بحالتِ موجودہ کتاب کی بعض عبارتیں پیچیدہ اور ہمارے روزمرّہ کے بہت خلاف نظر آتی ہیں اور بعض غیر ضروری مضامین بھی ہمارے ذوق اور معاشرت سے اِس قدر بعید و بیگانہ ہیں کہ شاید معمولی اُردو خواں اِن کا کوئی لطف حاصل نہیں کر سکتے۔ بہتر ہوتا کہ انھیں ترجمے سے حذف کر دیا جاتا۔

لغات اُردو (جلد اوّل و دوم۔ مؤلفۂ خواجہ محمد عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی۔ قیمت ۱۲؍ و ۸؍)

اُردو لغت کے یہ دو رسالے ہیں۔ پہلی جلد میں مصادر مفردہ کے لغوی اصطلاحی معانی اور محاورے ہیں اور دوسرے میں مصادر مرکبہ معاون فعل کے لغوی اصطلاحی معنی اور اُن کے استعمال کی مثالیں درج ہیں۔ یہ رسالے اگرچہ محققانہ نہیں ہیں مگر صحت اور احتیاط سے لکھے گئے ہیں اور طلبہ اور عام پڑھنے والوں کے لئے جو زبان سیکھنا چاہتے ہیں بہت مفید ہیں۔ ہمیں دیباچے میں یہ پڑھ کر بہت ہی افسوس اور رنج ہوا کہ خواجہ صاحب نے دو بارہ اُردو زبان کی کامل لغت تیار کی اور دونوں بار مسودے تلف ہو گئے۔ ایک مسودہ تو طغیانی کے نذر ہوا، اور دوسرا ایک سرپرست کے ہاتھوں ضائع ہو گیا۔ اب یہ تیسری بار ہی۔ اور اِس وجہ سے انھوں نے لغت کو چھوٹے چھوٹے رسالوں میں شائع کرنے کا ارادہ کیا ہی۔ لیکن یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ مصادر

مفردہ اور مصادر مرکبہ کو الگ الگ دو رسالوں میں کیوں شائع کیا۔ مفرد مصادر کے ساتھ مرکب مصادر بھی آسکتے تھے اور ایک جگہ ہونے سے ناظرین کو آسانی ہوتی۔ اب یہ بڑی دقّت ہے کہ مفرد تو ایک جلد میں ہیں اور مرکب دوسری جلد میں اور تیسری جلد میں مصدر مرکب کی قسم دوم کا بیان ہوگا، گویا ایک مشکل اور بڑھ جائے گی۔ خواجہ صاحب کو مغالطہ ہوا ہے۔ وہ دیباچے میں فرماتے ہیں "مصادر کے معانی لکھنے میں اہلِ لغت نے یہ فرق کر دیا ہے کہ مصدر مفرد اور مصدر مرکب کے ایک ہی معنی سمجھ کر مفرد مصدر کے معنی کی مثال مصدر مرکب سے پیش کی ہے جن میں درحقیقت زمین آسمان کا فرق ہے۔ لغت دیکھنے والے فائدے کے بدلے نقصان اُٹھاتے ہیں اور یہ تقلید بھی انگریزی زبان کی ہے" اوّل تو یہ انگریزی کی تقلید نہیں، دوسرے اگر کسی نے ایسا کیا ہے کہ باوجود فروق معانی کے ایک ہی معنی لکھدیئے ہیں تو غلطی کی، آپ اس کی تقلید نہ کریں۔ مگر اس سے مصادر کی تین الگ الگ جلدیں لکھنے کا جواز نہیں نکلتا۔ اگر دوسرے لغت نویسوں نے اس معاملے میں تفریط کی ہے تو خواجہ صاحب نے بھی افراط سے کام لیا ہے۔ مثلاً "تا پا کرنے" کے معنی سیکھتے رہنا۔ اس لکھنے سے کیا حاصل۔ ایسے بیسیوں مصادر ہیں جن کے ساتھ کرنا استمراری معنی دیتا ہے۔ مثلاً پیا کرنا، لکھا کرنا پڑھا کرنا وغیرہ وغیرہ صرف دیباچے میں یہ بتا دینا کافی ہے کہ کرنا جب امدادی فعل ہوتا ہے تو اس سے یہ معنی پیدا ہوتے ہیں۔ ہاں اگر اس کے خلاف کوئی نئے معنی پیدا ہوں تو لکھنا لازم ہے۔ "تا پا کرنے" کے نیچے "تانسنا کرنا" ہے اس کے معنی داغنا، طعنہ دینا لکھا ہے۔ لیکن "تانسنا" کے معنی بھی تو یہی ہیں۔ فرق کیا ہوا۔ غالباً یہاں لکھنے میں سہو ہوا ہے۔ کیوں کہ مثال سے صحیح معنی معلوم ہو گئے ہیں۔ اسی طرح جانا، ہونا، لگنا وغیرہ متعدد امدادی فعل ایسے ہیں کہ جب دوسرے مصادر کے ساتھ آتے ہیں تو معنی میں ایک خاص بات پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا بتا دینا کافی ہے۔ اب ہر مصدر کے ساتھ بلا وجہ ان افعال کو لگا کر تعداد بڑھانا فضول ہے۔ بھلا فرمانے لگنا بھی کوئی محاورہ ہے جو لغت میں لکھنے کے قابل ہے۔ مگر خواجہ صاحب نے یہ اور ایسے بہت سے مصادر مرکبہ (معاون فعل) درج لغت فرمائے ہیں۔ جب تک خاص معنی پیدا نہ ہوں اُن کا لغت میں لکھنا غیر ضروری ہے۔ اِس پر بھی جدید جلد قایم کرنے کی ضرورت ثابت نہیں ہوتی۔

"پا جانا" کے معنی صرف "ملنا" لکھے ہیں۔ اصطلاحی معنی رہ گئے ہیں، یعنی مطلب کا تاڑ جانا۔ "پا جانا" تو لکھا ہے

مگر پالینا رہ گیا ہے۔ پھوٹ نکلنا کے معنی اثر ہونا لکھا ہے جو صحیح نہیں معلوم ہوتا مثال یہ دی ہے۔
خدا کرے میرا نمک پھوٹ نکلے۔ اس کے معنی اثر ہونے کے نہیں بلکہ یہ دعا ہے کہ میرا نمک کھا کر
جو مجھسے بیوفائی کی ہے تو اس نمکحرامی کی سزا ملے۔ بھڑنا کے اصطلاحی معنی مقابل ہونا بتائے ہیں۔ یہ
اصطلاحی معنی نہیں بلکہ لغوی معنی ہیں ہندی میں بھڑنے اور بھیٹنے کے لغوی معنی ملنے کے ہیں۔ مڈھ بھیڑ
یا مٹھ بھیڑ میں یہی لفظ ہے اوندھنا کے معنی اُلٹا ہونے کے بتائے ہیں۔ مثال دی ہے کہ لوٹا اوندھا
ہے سیدھا کر دو۔ یہاں اوندھا صفت ہے بعینہ جیسے سیدھا۔ اوندھا استعمال میں نہیں آتا۔ اوندھانا
البتہ درست ہے۔ ہنکارنا بمعنی چیخنا۔ لیکن اس کے اصطلاحی معنی نہیں لکھے۔ جولاف مارنا ہیں۔ اسی طرح
برسنا کے اصطلاحی معنی لکھنے سے رہ گئے ہیں۔ پھسلنا کے صرف ایک اصطلاحی معنی لکھے ہیں دوسرے
معنی چھوڑ دیئے ہیں۔ اُبنا لکھا ہے مگر بُنا نہیں لکھا۔ شاید غیر فصیح سمجھا گیا ہے۔ اسی طرح بتورانا مصدر بھی
اس رسالہ میں درج نہیں کیا گیا۔ شاید آج کل اس کا استعمال معیوب خیال کیا جاتا ہو یا متروک ہو گیا ہو
بہرحال میرانیس تو استعمال کرتے تھے جچنا کے ایک معنی تخمینہ ہونا تو لکھا ہے مگر دوسرے معنی پسند آنا
نہیں لکھے۔

یہ چند خفیف فروگزاشتیں ہیں جو سرسری نظر میں ہمیں معلوم ہوئیں مگر ان سے کتاب کی اصل خوبی
پر کوئی حرف نہیں آتا اور اُمید ہے کہ آیندہ ان کی اصلاح ہو جائے گی۔ لیکن دو باتوں کی طرف ہم
خاص طور پر خواجہ صاحب کی توجہ مبذول کرنا چاہتے ہیں۔ ایک اعراب بڑے احتیاط کے ساتھ
لگائے جائیں۔ بعض جگہ جہاں اعراب کی ضرورت تھی نہیں لگائے گئے اور بعض مقامات پر غلط اعراب
لگے ہوئے ہیں۔ دوسرے الفاظ کے درج کرنے میں ترتیب کا مطلق لحاظ نہیں کیا گیا۔ ہر حرف کے نیچے
الفاظ بلا ترتیب لکھ دیئے گئے ہیں۔ مثلاً الف کے تحت میں سب سے اوّل آزمانا اس کے بعد اَنکنا،
آنکنا، آنا اور پھر اُبلنا درج ہے۔ ایک لفظ کی تلاش میں ساری ردیف دیکھنی پڑتی ہے۔ اُمید ہے کہ
آیندہ طبع میں اس کی اصلاح فرما دی جائے گی۔

مذہب

اِسلام میں کوئی فرقہ نہیں - اِس کتاب میں خواجہ کمال الدین صاحب امام مسجد ووکنگ (انگلستان) مشہور اسلامی مشنری نے بدلائل اس امر کے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام میں دوسرے مذاہب کی طرح فرقے نہیں۔ یعنی اصول میں کہیں اختلاف نہیں' اگر ہی تو فروعی امور اور جزئیات میں ہے یعنی یہ ایسے امور ہیں جن میں اختلاف کرنے سے کوئی شخص اسلام سے خارج نہیں ہوتا۔ اِس مسئلہ پر انھوں نے اِس کتاب میں بہت اچھی بحث کی ہے۔ چوں کہ خواجہ صاحب انگلستان میں تبلیغ اسلام کا کام کر رہے ہیں اکثر لوگوں کے دلوں میں یہ شبہ پیدا ہوتا تھا کہ وہاں کے نومسلموں کو کس فرقے کی تعلیم دی جاتی ہی کہیں وہ احمدی تو نہیں بنائے جاتے۔ اِس کا جواب بھی خواجہ صاحب نے تفصیل سے دیا ہے اور اپنے عقیدے کو بھی صاف صاف بتا دیا ہے۔ حکیم اجمل خاں صاحب نے بھی یہی سوال خواجہ صاحب سے کیا تھا۔ خواجہ صاحب نے اِس کے جواب میں ایک طویل خط جناب حکیم صاحب کے نام لکھا ہی جو اس کتاب میں درج ہے۔ خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ میں بیشک احمدی ہوں۔ لیکن میں جناب مرزا صاحب مرحوم کو مجدد، ولی اور پیر و مرشد سمجھتا ہوں، نبی نہیں سمجھتا۔ خود حضرت میرزا صاحب نے بھی کبھی نبوت کا دعویٰ نہیں کیا۔ چنانچہ وہ ایک جگہ فرماتے ہیں ع

"من نیستم رسول ونیاوردہ ام کتاب"

اور جہاں کہیں انھوں نے اپنے لئے نبی کا لفظ استعمال کیا ہی تو اس کے معنی حقیقی نبی کے نہیں ہیں' وہ اِس سے ظلّی، مجازی، بروزی، جزوی نبوت مراد لیتے ہیں۔ چنانچہ مرزا صاحب اُن اولیائے کرام کے متعلق جن میں سے وہ اپنے آپ کو بھی سمجھتے تھے یہ فرماتے ہیں۔

"وایشاں را رنگ انبیا دادہ می شود۔ درحقیقت انبیا نیستند۔ زیراکہ قرآن حاجت شریعت را بکمال رسانیدہ است"۔

خواجہ صاحب احمدیوں کے اُس فرقے کو بہت بُرا بھلا کہتے ہیں جو مرزا صاحب کو نبی مانتے ہیں۔ اور خود مرزا صاحب ہی کے اقوال سے اس کی تردید کرتے ہیں۔ غرض یہ ہے کہ احمدی فرقہ میں کوئی بات ایسی نہیں جو اسلام کے عقائد و اصول کے خلاف ہو۔ البتہ بعض جزئیات میں اختلاف ہے اور وہ ایسی ہیں کہ جس کے ماننے والے سلف صالحین میں بھی تھے۔ خواجہ صاحب انگلستان میں خالص اسلام اور کلمۂ توحید کی تبلیغ کرتے ہیں۔ ان کی تبلیغ کو کسی فرقے سے لگاؤ نہیں اور نہ وہ اسلام میں فرقہ بندی کے قائل ہیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم ان سے بدگمانی کریں اور خواہ مخواہ احمدیوں کو اسلام سے خارج سمجھیں یا اُن پر تبرّا کہیں اور کفر کے فتوے دیں۔

خواجہ صاحب نے جو خط حکیم اجمل خاں صاحب کو لکھا ہے اس میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں "بیشک میں پختہ کار احمدی ہوں اور فطرتاً اس امر کو چاہتا ہوں کہ دُنیا میں احمدیت پھیل جائے۔ لیکن میری احمدیت کا مقدم حصّہ یہی ہے جو میں نے اسلامک ریویو میں تبلیغ کیا اور جس سے کسی غیر احمدی نے بھی آج تک اختلاف نہیں کیا" جب یہ ہے تو پھر بیچ میں احمدیت کو لانے یا اسلامی تعلیم کو اس سے منسوب کرنے کی ضرورت ہے؟ خواجہ صاحب پختہ کار احمدی ہوں اس سے کسی کو اختلاف کا حق نہیں۔ لیکن ہماری رائے میں یہی ایک تھوڑی سی خامی اُن میں ہے۔ جو شخص اسلام سے فرقہ بندی مٹانا چاہتا ہے۔ سب سے پہلے خود اُسے اس قید سے آزاد ہونا چاہیئے ورنہ اِس بحث کا نام نہ لے۔

(کتاب دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ہے۔ بہت اچھے کاغذ پر چھپی ہے۔ تقطیع چھوٹی صفحات ۲۰۸ قیمت قسم اوّل (عہ) قسم دوم (عہ) مُسلم بک سوسائٹی۔ عزیز منزل لاہور سے مل سکتی ہے)

جدید رسالے

الفلاح۔ یہ نیا رسالہ مہینے میں دو بار انجمن اشاعت اسلام جالندھر کی سرپرستی میں شائع ہوتا ہے اڈیٹر غازی رحمت اللہ صاحب ہیں۔ اِس رسالہ کا مقصد دعوت و تبلیغ، انتقاد مذاہب، تصحیح عقائد اور صلاح اعمال ہے۔ اس رسالہ میں جو دوسرا نمبر ہے، وید، اسلام و مسلم، بقیۂ شعبان و تہیۂ رمضان، مسلم (نظم) اور

روئداد زنانہ مدرسۃ القرآن کے مضامین ہیں۔ تبلیغ وغیرہ کے متعلق کسی قسم کی کوئی خبر یا اطلاع درج نہیں ہے۔ مضامین معمولی درجے کے ہیں۔ یہ رسالہ غالباً ہندو مسلم اختلاف کے زمانہ کی پیداوار معلوم ہوتا ہے۔ رسالہ کے اس نمبر کی ضخامت ۴۰ صفحہ ہے لیکن معمولاً ۳۲ صفحہ ہوتی ہے سالانہ چندہ چار روپیہ ہے۔

نوائے ہند۔ یہ رسالہ انگلستان کی انجمن اردو کا ہے جو انجمن ترقی اردو کی شاخ ہے۔ اور ہندوستان کے طلبۂ مقیم انگلستان نے مرتب کیا ہے۔ تمام مضامین نظم و نثر انھیں صاحبوں کے لکھے ہوئے ہیں۔ ان کی یہ کوشش بہت قابل قدر ہے۔ وطن کی یاد کا اس سے بہتر وہ اور کیا ثبوت دے سکتے تھے۔ وہاں وہ سب خواہ کسی ملت و مذہب کے ہوں، ہم زبان و ہم خیال ہیں۔ خدا کرے جب وہ اپنے وطن واپس آئیں تو یہ جذبہ اُن میں اور قوی ہو اور اپنے بدنصیب ہموطنوں کے لئے مثال بنیں۔ یہ رسالہ انجمن ترقی اردو کی معرفت مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ میں چھپا ہے۔ کاغذ اعلیٰ درجہ کا، لکھائی چھپائی اس قدر نفیس اور پاکیزہ ہے کہ میری نظر سے اس زمانے میں کوئی کتاب یا تحریر اس پایہ کی نہیں گزری۔ قابل دید ہے۔ اس کے لئے انسٹی ٹیوٹ پریس کے مستعد اور قابل منیجر مولوی محمد مقتدیٰ خاں صاحب شروانی قابل ستایش ہیں۔ سال میں دو بار شائع ہوگا۔ قیمت فی پرچہ (۸؍) انجمن ترقی اردو اورنگ آباد، دکن سے مل سکتا ہے۔ میں اس کی خریداری کی بطور خاص سفارش کرتا ہوں آپ دیکھکر بہت خوش ہوں گے۔

علی گڑھ میگزین۔ یہ کوئی جدید رسالہ نہیں۔ علی گڑھ کالج سے یہ پہلے پہل، جسے غالباً تیس سال ہوتے ہیں، علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کے ضمیمے کے طور پر نکلا تھا۔ کچھ دنوں بعد الگ شائع ہونے لگا۔ ایک حصہ اردو دوسرا انگریزی ہوتا تھا۔ اِس کی ترتیب میں اُستاد شاگرد دونوں کا ہاتھ ہوتا تھا۔ مگر اِس کی حالت کبھی اچھی نہ تھی اور شرم معلوم ہوتی تھی کہ علی گڑھ کالج سے ایسا رسالہ نکلتا ہے۔ چند سال ہوئے دفعتہً اس نے کینچلی بدلی اور نئے رنگ روپ سے نکلا۔ اس کی تجدید و ترقی کا سہرا رشید احمد صاحب صدیقی ایم اے کے سر ہے انھوں نے اسے بنایا بڑھایا، خود لکھا دوسروں سے لکھوایا۔ اپنی ظرافت نگار قلم سے کام لیا اور صاحب ذوق احباب سے مضمون بہم پہونچائے۔ چند ہی روز میں اس کا شمار اردو کے بہترین رسالوں میں ہونے

لگا۔ جب صدیقی صاحب طالب علمی کے حلقے سے نکل کر پروفیسری کے طبقے میں پہونچے (خوشی کی بات ہی کہ وہ آج کل یونیورسٹی میں اُردو کے پروفیسر ہیں) تو یہ امانت یونیورسٹی کے ہونہار طالب علم خواجہ منظور حسین صاحب سلمہ کے تفویض ہوئی۔ خواجہ صاحب نے اسے اور چمکایا اور اس کی ترقی و تربیت میں ایسی مستعدی اور محنت سے کام کیا کہ ماشاءاللہ اب اسے نظر لگتی ہی اور ہر مہینے اس کا ظاہری اور باطنی جمال عروج پر نظر آتا ہی۔ خواجہ صاحب کی محنت لایق داد ہی اور اُن کا تقاضا قابلِ رشک۔ مضمون کے لئے وہ اس طرح پنجے جھاڑ کے پیچھے پڑتے ہیں کہ بغیر جھوٹے سچے وعدے کے اُن سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا ہی اور وعدے کے بعد اُن کے ہاتھوں سے صحیح سلامت بچکر نکل آنا محال ہی۔ مجھے کالج میگزین کی ایسی اچھی حالت دیکھکر حقیقی مسرت ہوتی ہی اور جب کبھی میں اپنے زمانے اور اِس زمانے کے میگزین کا مقابلہ کرتا ہوں تو بے اختیار میرے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ شاید یہی فرق اُس زمانے اور اِس زمانے کے طالب علموں میں بھی ہی۔

ترقیِ اُردو کے متعلق ایک نئی تحریک

اس میں شبہ نہیں کہ پنجاب کی ادبی زبان اب اُردو ہو گئی ہے اور اہلِ پنجاب نے جس شوق اور محنت سے اس کے حاصل کرنے اور ترقی دینے میں کوشش کی ہی وہ ہر لحاظ سے قابلِ شکریہ ہی۔ لاہور اس صوبے کا علمی مرکز ہی۔ وہاں سے اِس قدر اُردو اخبار اور رسالے نکلتے ہیں اور اُردو کتابیں شائع ہوتی ہیں کہ ہندوستان کا کوئی شہر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ علاوہ اِس کے مختلف انجمنیں خیالات و زبان کی ترقی کے لئے قایم ہیں۔ اہلِ لاہور کو اُردو زبان سے جو دلچسپی رہی ہی اور اِس وقت ہی وہ کسی تفصیل کی محتاج نہیں۔ ہمارے ایک عنایت فرمانے ہمیں اطلاع دی ہی کہ حال ہی میں ایک نئی تحریک اُردو زبان کی ترقی کے متعلق لاہور میں ہوئی ہے جس کا مقصد یہ ہی کہ پنجاب کو دلّی و لکھنؤ کے اہلِ زبان کی نام نہاد سیادت سے آزاد کیا جائے، اور اُن کی پیروی صرف اُس دور تک کی جائے جو امیر اور داغ پر ختم ہو گیا ہے نئے الفاظ حسب ضرورت تجویز کئے جائیں۔ اور دلّی اور لکھنؤ کی زبان میں جہاں اختلاف ہو وہاں بہتر محاورہ

اختیار کیا جائے۔ اس تحریک کو عمل میں لانے کے لیے عنقریب ایک ماہوار رسالہ بھی جاری ہونے والا ہے جس میں تمام مضامین صرف اُدبائے پنجاب کی قلم سے ہوں گے۔ مختلف مضامین مختلف حضرات کے سپرد کیے گئے ہیں۔ وہ ان کا مطالعہ خاص طور پر کریں گے۔ پنجابی اور اُردو زبان میں جو محاورے یکساں استعمال ہوتے ہیں یا جن میں بہت تھوڑا فرق ہے اُن کی ایک لغت مرتب کی جائے گی۔

اس تحریک سے اہلِ لاہور کا شوق اور دلچسپی ظاہر ہے۔ ہم خوش ہیں کہ وہ اُردو زبان کی ترقی اور اصلاح میں مصروف ہیں۔ اہلِ دہلی و لکھنؤ کو بُرا ماننے کی کوئی وجہ نہیں ہے بلکہ ضرورت ہو تو ان کی مدد کرنی چاہیئے۔ یہ وقت ایسا ہے کہ اُردو کی ترقی کے لیے جو کوشش بھی کی جائے (خواہ وہ کہیں ہو) اُسے غنیمت سمجھا جائے اور اس کی قدر کی جائے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں اور چند مقامی الفاظ کے لیے جھگڑے کرنا زبان کی ہمدردی نہیں بلکہ دشمنی ہے۔ ہم اہلِ لاہور کو مبارک باد دیتے ہیں اور یقین کرتے ہیں کہ اُن کی سعی بار آور ہو گی بشرطیکہ اُن کی تحریک عامیانہ اور معاندانہ بحثوں سے پاک رہی۔

اُردو

۱- انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ ہے جو جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر کے ...
میں شائع ہوا کریگا۔

۲- یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں زبان و ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ...
حجم کم سے کم ۱۵۰، اور زیادہ سے زیادہ ۲۰۰ صفحہ ہوگا۔

۳- قیمت نو روپے بارہ آنے سالانہ معہ محصول ڈاک اور ارکانِ انجمن ترقی اردو سے آٹھ روپے بارہ ...

۴- خط و کتابت آنریری سکرٹری انجمن ترقی اردو و اڈیٹر اردو اورنگ آباد دکن سے ہونی چاہیے

محمد مقتدی خاں شروانی مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ میں چھپا اور دفتر ...